

# بارے غالب کا کچھ بیاں ہو جائے

پرتور وہیلہ





**PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani**

**Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081**



پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»  
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

# بارے غالب کا کچھ بیاں ہو جائے

پرتو روہیلہ

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی۔ ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال

کراچی۔ ۷۵۳۰۰

سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان: ۶۴۵

ISBN-978-969-403-168-2

اشاعت اول:

۲۰۱۲ء

تعداد:

پانچ سو

مطبع:

غزالی برادرز، ناظم آباد،  
کراچی

(دیکھ سرکاری امداد یافتہ اداروں کی طرح  
انجمن ترقی اردو پاکستان کو بھی اشاعت کتب کے لیے  
اکادمی ادبیات پاکستان کے توسط سے امداد ملتی ہے)

انتساب

اشفاق سلیم مرزا کے نام

## فہرست مضامین

حرفے چند	جمیل الدین عالی	ح
غالب کی زندگی کے تین اہم فیصلے	پرتورو میلہ	۲۲۵۱
نیا زفتح پوری کی "مشکلات غالب"	//	۳۶۵۲۳
غالب کی انھما نگاری و فارسی نامہ نویسی	//	۵۸۵۳۷
غالب کے دینی و لہجہی عقاید	//	۸۶۵۵۹
والہ حیدر آبادی اور شرح اشعار غالب	//	۱۰۳۵۸۷
نقشہ کا نادر مرحلہ غالب	//	۲۲۵۵۱۰۳

## حرفے چند

غالب شناسی اور مطالعہ غالب ایک ایسی کائنات ہے کہ ایٹمکٹن اور اسٹیلن ہاسٹک کی ”کائنات“ کی طرح برابر وسعت پذیر ہو رہی ہے۔ ہر مرحلے پر خیال آتا ہے کہ شاید یہ کام یا یہ تحقیق غالب پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہو لیکن پھر کوئی غالب شناس غم ٹھوٹک کر میدان میں آ جاتا ہے کہ ”یہ وقت ہے کلکتہ نکل پائے ناز کا“ اور غالب شناسی کا ایک آدھ در اس طرح وا کرو جتا ہے کہ اس میں نئی کرنوں کی درآمد کے ساتھ ساتھ غالب کے خدو خال بھی نئے زاویوں سے نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

جناب پر نور وہیلہ ایک نغمہ گو شاعر، دو ہا نگار، سفر نامہ نویس کی حیثیت سے تو معروف تھے ہی لیکن باور چند برسوں سے انھوں نے غالب شناسی کے میدان میں خصوصاً غالب کے مکاتیب فارسی کے تراجم و تدوین کے ضمن میں جو کارنامے سرانجام دیے ہیں وہ ہر اعتبار سے لائق تحسین و ستائش ہیں۔ پاک و ہند میں یکساں طور پر جناب پر نور وہیلہ کی ان کاوشوں کو سراہا جا رہا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ”بارے غالب“ کا کچھ جہاں ہو جائے“ ہے جو انجمن ترقی اردو مسرت و انجسار کے ساتھ شائع کر رہی ہے۔

غالب کا تعلق شروع سے انجمن سے رہا ہے۔ یادگار تحریریں انجمن کے ذریعہ اہتمام شائع ہوتی رہیں۔ ان میں باباے اردو مولوی عبدالحمق کی ”رد و او مقدمہ غالب“ خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کا مقدمہ دیوان غالب جو ”محاسن کلام غالب“ کے نام سے موسوم ہے اور جس سے جدید خطوط پر غالب شناسی کا آغاز ہوتا ہے۔ انجمن کے جریڈے ”اردو“ (جنوری ۱۹۶۱ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت سے یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

پر نور وہیلہ کی اس کتاب میں ان کے متفرق تحقیقی و تنقیدی مضامین شامل ہیں جن سے غالب شناسی کے کئی نرغ سامنے آتے ہیں اور اس باب میں پائے جانے والے کئی امکانات کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے۔

فاضل مصنف و مرتب اردو، انگریزی اور پشتو کے علاوہ فارسی پر بھی قابل رشک دسترس رکھتے ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر توجہ غالب کے شاعرین پر صرف کی ہے۔ جن میں علامہ نیاز علی پوری اور ”دو ٹی سراحت“ کے مصنف وائے حیدر آبادی بہ طور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان شاعرین

سے تہذیب و تمدن کی کے دائرے میں رہتے ہوئے پروردہ میلہ نے اختلاف بھی کیا ہے۔ تاہم وہ پتھر آبادی کی اولین شرح غالب کے بعض نکات اس طرح اہا کر کے ہیں کہ غالب جنہی میں ان سے کما حقہ مدلل بنتی ہے۔ غالب کے تین اہم فیصلے، غالب کے مذہبی معتقدات پر بھی سیر حاصل تحقیق کر کے نتائج کا استنباط کیا ہے۔ جن کے بعد ”ملائے عام ہے بارانِ بکھتہ دال کے لیے“ جیسی راہیں بھی مزید تحقیق کے لیے کھل جاتی ہیں۔

میں کئی بار اس امر کا اعادہ کر چکا ہوں کہ نہ اس نسبت پر غور ہے، نہ افسوس مگر راقم کا تعلق خانوادہٴ لوہارو سے ہے اور اس خاندان سے غالب کی سہمی اور علمی اور عصبانہ نسبت معروف ہے۔ چنانچہ غالب کے باب میں جب کوئی نئی دریافت سامنے آتی ہے تو خصوصاً توجہ کے ساتھ پڑھتا اور غور کرتا ہوں۔ اس ضمن میں مجھے یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوئی کہ چنانچہ پروردہ میلہ نے غالب کے ایک مزید ترین شاگرد جو شمل ان کی اولاد کے تھے، میرزا ہرگوپال نقضہ کی غالب شناسی کا ایک اہم باب اپنی اس کتاب میں تصارف کرایا ہے۔ غالب کی وفات کے بعد جاتی، مجروح اور کئی دیگر شاگردان و عقیدت مند ان غالب نے مرثیہ لکھے۔ ان میں مرزا نقضہ کا طویل مرثیہ غالب جو فارسی زبان میں ہے پہلی بار صرف اودھ اخبار میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں ایک اہم غالب شناس ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنی کتاب ”نواور غالب“ (مطبوعہ ادارہ یادگار غالب کراچی) میں شامل کر دیا تھا۔ پروردہ میلہ نے نہ صرف اس مرثیے کو اپنی اس کتاب میں تمام وکمال شامل کر دیا ہے بلکہ ہر شعر کا اردو میں ترجمہ بھی کر دیا ہے۔ یہ ایک طویل مرثیہ ہے اس کی زبان تک پہنچنا کہ یہ دور فارسی زبان سے خاصا دور ہو چکا ہے اور کچھ لینا محال ہی تھا۔ لیکن اب پروردہ میلہ کی یہ کاوش جیسے میں Labour of love ہی قرار دوں گا، عام اردو دہاں بچنے کے مطالعے کے لیے بھی وہ نمائی کرے گی۔ نقضہ کے فارسی دو لوہین کا تذکرہ تو سنتے ہیں لیکن وہ شاید اب تک زیور طباحت سے آراستہ نہیں ہو سکے۔ اس کا ایک ثبوت اس امر سے بھی ملتا ہے کہ انجمن کے نائب مہتمم ادبی امور پروفیسر سحر انصاری نے مجھے بتایا ہے کہ عہدہٴ منورہ میں گزشتہ چالیس سال سے مقیم شاعر اور بیہل شناس چنانچہ حامد الخاں نے میرزا ہرگوپال نقضہ کے چار لکھی دیوان حاصل کیے ہیں اور ان کا ارادہ ہے کہ مکمل نہ سہمی ان کا ایک انتخاب مقدمے کے ساتھ شائع کریں۔ ایسا ہو جائے تو کیا کہنا!

آخر میں راقم ایک بار پھر جناب پروردہ میلہ کو مبارکباد پیش کرتا ہے کہ وہ غالب شناسی کی راہ میں آگے آگے بڑھ رہے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ ایسے گوہر آب دار ان کی علمی خواہی کے نتیجے میں آئندہ بھی اردو دنیا تک پہنچتے رہیں گے۔



## غالب کی زندگی کے تین اہم فیصلے

غالب کی زندگی پیدائش سے لے کر ان کی موت تک ہنگاموں سے لبریز رہی۔ قدم قدم پر وہ ایسے شدید حالات سے دوچار ہوئے جہاں انھیں سلیم الطہی کے اظہار کے ساتھ قوت فیصلہ کے استعمال کی بھی شدید ضرورت ہوتی۔ سو اگر ان کی ہر آشوب زندگی کا احاطہ کیا جائے تو ایسے مواقع ہزاروں نہیں تو سیکڑوں ضرور ہوں گے جو ان کے لیے بہت اہم تھے۔ اب اگر ان سیکڑوں اہم واقعات سے اہم ترین منتخب کیے جائیں تو میری نظر میں وہ صرف تین بنتے ہیں اور وہ اس لیے نہیں کہ ان سے مقابل ہو کر غالب نے انتہائی ہوشیاری اور سلیم الطہی کا اظہار کیا بلکہ اس لیے کہ اس وقت کے حالات سے دوچار ہو کر غالب نے جو فیصلے کیے وہ، نئے اہم، اثر انگیز اور دور رس تھے کہ انھوں نے نہ صرف غالب کی زندگی کا رخ بدل دیا بلکہ اردو ادب کی تاریخ پر بھی نہ مٹنے والے نقوش مرتسم کر دیے۔ ان اہم ترین فیصلوں میں سب سے واقع فیصلہ اسلوب ہیدل کو ترک کر کے آسان گوئی کا فیصلہ ہے۔ دوسرا فیصلہ وہ ہے جو انھوں نے نکلنے جاتے ہوئے گھسٹ کے قیام کے دوران آغامیر سے ملاقات کے لیے اپنی چند شریا پیش کر کے کیا اور تیسرا فیصلہ وہ ہے جو انھوں نے دہلی کالج کی مدری سے انکار کی صورت میں کیا۔ ظاہر ہے کہ ان تینوں فیصلوں میں پہلا فیصلہ تو خالصتاً ادبی ہے، یعنی جس کا تعلق غالب کی ادبی شخصیت، اور ان کی ادبی اقدار سے ہے جب کہ باقی دونوں فیصلے غالب کی معاشی سے تعلق رکھتے ہیں اور اگرچہ فیصلوں کی اپنی بنیاد سماجی اور اخلاقی اقدار پر کیوں نہ ہو ان کے نتائج لازماً معاشی تھے۔

زیر نظر مضمون میں ان عوامل پر ہی بات ہوگی جو ان تینوں فیصلوں کا باعث ہوئے۔

عبدالمصمد (برمزد) کا غالب کی زندگی میں ورود ایک اتفاق بلکہ حسن اتفاق سی لیکن دس گیارہ سال کی عمر میں ان کی شاعری کی طرف میلان اور پھر علمپوری اور ہیدل جیسے فارسی شعرا کی طرف رغبت تو لازمی ان کے فطری رجحانات تھے جن سے خود ان کے لیے کوئی سفر نہیں تھا۔ اس لیے جب غالب مبداء قیاض کی بات کرتے ہیں تو غلط نہیں کہتے۔ ورنہ ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ عبدالمصمد کے زیر اثر انھوں نے آگرے ہی میں فارسی شاعری بھی شروع کر دی ہوتی۔ جب کہ فارسی شاعری پر انھوں نے تقریباً کلکتے کے سفر کے دوران زور دیا۔ سو کلکتے کے قیام کے دوران سراج الدین احمد کے ایما پر انھوں نے گل رعنا کا انتخاب کیا اور اپنے اردو کلام سے دو ٹکٹ نکال ڈالے تو یہ اس دیوان سے تھا جو سفر کلکتے سے پہلے مرتب ہو چکا تھا۔

گل رعنا کے دیباچے رنختہ میں غالب بڑے ہڈ و مد سے تحریر فرماتے ہیں:

”نگارندۂ ایس نامہ را آں در سراست کہ پس از انتخاب دیوان رنختہ  
گہر و آردن سرمایہ دیوان فارسی بر نیز دو ہاستفادۂ کمال این فریور فن  
پس از انوئے خوشنصیب نصیب۔ امید کہ سخن سراپاں سخنور ستائی پر آمد  
ایمانی را کہ خارج ازیں اوراق یا بند، از آچار تراوش رگ کلک ایس  
نامہ سیاہ بختا سند و چامہ گرد آرد راستائیش و بگوش آں اشعار ممنون و  
ماخوذ نگارند۔ یا رب ایس یونے ہستی ناشدیدہ از نیستی بہ پیدائی نا  
رسیدہ یعنی نقش ضمیر آمدۂ نقاش کہ بہ اسد اللہ خاں موسوم و بہ سرزا  
نوشہ معروف و بر غالب متخلص است چنانچہ اکبر آبادی مولد و دہلوی  
مسکن است فرجام کار جنتی مدفن نیز باد۔“

(کلیات نثر غالب ۱۸۸۷ء مطبع نول کشور، ص ۶۰)

یہاں غالب یہ نہیں بتاتے کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں یعنی اپنا دو تہائی اردو کلام ۸  
نظری کر دینے کا سبب کیا ہے۔ البتہ وہ دیباچہ ”گل رعنا“ میں اتنا ضرور فرماتے ہیں:

”میں نے اردو گوئی میں بھی وہی طریقہ روا رکھا ہے جو فارسی میں روا رکھا تھا۔ میری شاعری کے دو دروازے ہیں۔ ایک اردو اور ایک فارسی۔“ (آثار غالب۔ شیخ محمد اکرام۔ ص ۷۷)

دسپاچے میں اصل الفاظ اس طرح ہیں:

”چوں در آغاز خار خار بگر کاوئی شوق ہمہ صرف نگارش اشعار اردو زبان بود، در مسلک این تحریر نیز ہماں چادہ گزار دہ و ہماں راہ سپردہ شد۔ ہر آئینہ این چہستان را دور بروی ہم کشود۔ غنچیں در با اشعار ہندی بگو ہر آمودم دو بکس در چوں آغوش شوق بروئی پارسیاں واست وہام این صیفہ بزبان ادا شاساں گل رعنا۔ الہی این گل رعنا را بکوشے دستار قبول چا وہی و ہر کہ این را گرامی می نہد سپاسی از وی برمن نمی، اللہ بس باقی ہوں۔“

(کلیات نثر غالب ۱۳۹۷ھ مطبع نول کشور، ص ۵۹)

اب چوں کہ ہر اگراف ماقبل میں ہے کہ ”نگارندہ این نامہ آن ... بگرد آور دن سرمایہ و فارسی برخیزد“ اور یہاں وہ خود لکھتے ہیں کہ ”بگر کاوئی شوق ہمہ صرف نگارش اشعار اردو زبان بود“ اس لیے مسلک این تحریر سے یہاں مطلب فارسی ہوا اور ”ہماں چادہ گزار دہ و ہماں راہ سپردہ شد“ سے مطلب یہ ہوا کہ فارسی میں بھی میں نے وہی راہ اختیار کی ہے جو اردو میں اختیار کی تھی۔ جب کہ محترم محمد اکرام صاحب نے اس کے برخلاف لکھا ہے یعنی اردو میں وہ راہ اختیار کی ہے جو فارسی میں اختیار کی تھی۔ بہر صورت فی الوقت مسئلہ زیر بحث صرف یہ ہے کہ خود پسند، مغلوب الاماء، انفرادیت گزیدہ غالب نے کن حالات کے تحت اپنے اسلوب شاعری میں تبدیلی کا فیصلہ کیا اور وہ کیا عوامل تھے جو اس فیصلے کے ذمے دار ہوئے۔

ہم مصر شاہدوں میں جاتی سے بڑھ کر مستند و موثر گواہ کون ہو سکتا ہے۔ سو وہ اس ضمن میں یادگار غالب میں کہتے ہیں ”مرزا کے حق میں جو پیش گوئی میر تقی میر نے کی تھی اس کی

دونوں شقیں ان کے حق میں چوری ہو گئیں۔ ظاہر ہے مرزا اذل اذل ایسے رستے پر چڑھے تھے کہ اگر استقامت، طبع اور سلامتِ ذہن اور بعض صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک اور نکتہ چیں ہم مصروں کی خردہ گیری و وطن و قریض، سد راہ نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزل مقصود سے بہت دور جا پڑتے۔ سنا گیا ہے کہ اعلیٰ و فی مشاعروں میں جہاں مرزا بھی ہوتے تھے تعریفنا ایسی غزلیں لکھ کر لاتے تھے جو الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت بڑی شوکت و شان دار معلوم ہوتی تھیں مگر معنی غارو۔ گویا مرزا پر ظاہر کرتے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔“ (یادگار غالب، ص ۱۱۱) اکثر سوانح نگاروں نے ان تینوں عوامل کا ذکر کیا ہے۔

صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک کے ضمن میں حالی کہتے ہیں۔ ”جب مولوی فضل حق سے مرزا کی راہ و رسم بہت بڑھ گئی اور مرزا ان کو اپنا خاص و مخلص دوست اور خیر خواہ سمجھنے لگے تو انھوں نے اس قسم کے اشعار پر روک ٹوک کرنی شروع کی۔ یہاں تک کہ انھیں کی تحریک سے انھوں نے اپنے اردو کلام میں سے جو اس وقت موجود تھا دو ٹکٹ کے قریب نکال ڈالا اور اس کے بعد اس روش پر چلتا بالکل چھوڑ دیا۔“ ظاہر حالی کی نظر میں ان صحیح المذاق لوگوں میں صرف یا خصوصاً مولوی فضل حق ہی تھے جن کی ایما پر غالب نے اپنی پرانی روش ترک کی۔ ذکر غالب میں مالک رام صاحب نے بھی مولوی فضل حق ہی کا ذکر کیا ہے۔ ”اردو میں وہ اپنی بیدلانہ طرز مولوی فضل حق کی روک ٹوک پر ٹکٹہ جانے سے پہلے ترک کر چکے تھے۔“ (ص ۱۶۰) لیکن دوسرے سوانح نگار مولوی فضل حق کے ساتھ آزدہ اور شیفہ کو بھی شامل کرتے ہیں۔ شامل ہی نہیں کرتے بلکہ برابر کا شریک قصور کرتے ہیں۔ چنانچہ تالیپاری کا ریٹا اپنی مشہور تصنیف غالب میں تحریر کرتی ہیں۔ ”بہت سوں کا خیال ہے کہ اگر فضل حق نہ ہوتے تو غالب کے حق میں میر کی یہ پیش گوئی کہ کامل استاد نہ بننے کی صورت میں یہ لڑکا بھل جکتے لگے گا، سچی بات ثابت ہوئی۔ غالب کے اسلوب کے تعلق سے ایسی سخت گیری کا مظاہرہ کرنے میں فضل حق اکیلے نہیں تھے۔ آزدہ جیسے خن جاج اور سادگی کے شیدائے بھی غالب کو اعتبار خیال کے دوسرے وسائل کی تلاش کی ترغیب دی۔ ان کے اثر سے نہ صرف اسلوب شاعری میں بلکہ شاعر کے مزاج

میں بھی سلامت دوی پیدا ہوئی۔ ط۔ انصاری تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ درشتی عبدالصمد کو نہیں بلکہ فضل حق، آزاد اور شیخہ وغالب کا استاد سمجھنا چاہیے۔ (ص ۱۳۵، ۱۳۷)

طعن و تخریض اور ہم مصرعوں کی خرد گیری کے ضمن میں ایک لطیفہ بہت دہرایا گیا ہے جس کا حالی نے مولوی عبدالقادر رامپوری کی جب کہ پون کمار ورنائے (غالب، شخصیت اور حمد) آغا جان بخش کی زبانی بتایا ہے۔ حالی کی زبانی یہ لطیفہ اس طرح ہے: ”ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے جو نہایت عظیم الطبع تھے اور جن کو قلعہ دہلی سے قتل رہا تھا، مرزا سے کسی موقع پر کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا اور اسی وقت دو مصرعے سمجھ کر کے مرزا کے سامنے چڑھے۔

پہلے تو روغن گل بھینس کے اٹھ سے نکال

پھر دوا بختی ہے گل بھینس کے اٹھ سے نکال

مرزا سن کر سخت حیران ہوئے اور کہا حاشا یہ میرا شعر نہیں۔ مولوی عبدالقادر نے ازراہ حراج کہا: ”میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے اور دیوان ہو تو میں ابھی دکھا سکتا ہوں۔ آخر مرزا کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس چیرائے میں اعتراض کرتے ہیں اور گویا یہ جانتے ہیں کہ تمہارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔“ (ص ۱۱۲)

ظاہر ہے غالب کے کلام میں وہ سارے اشعار جو انھوں نے اخفائے حال، ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا نہ ہونے یا کوئیم مشکل و گرد کوئیم مشکل کی ضمن میں کہے ہیں وہ درحقیقت اس ہم مصرعی خرد گیری اور طنز و تخریض کے جواب میں دفا عانی کہے گئے ہیں اور اس کی شدت کی تصدیق کرتے ہیں۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سبھی

مگر خاموشی سے قاعدہ اخفائے حال ہے

خوش ہوں کہ میری بات سمجھتا محال ہے

مشکل ہے زبیں کلام میرا اسے دل  
ہوتے ہیں غول اس کو سن کے جاہل  
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمایش  
گویم مشکل دگر نہ گویم مشکل

رہی بات استقامتِ طبع اور سلامتِ ذہن کی تو اس کا چوں کہ غالب کی شخصیت سے  
براہ راست تعلق ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان عوامل پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈال لی  
جائے جنہوں نے غالب کی شخصیت کی تعمیر میں مدد کی۔

مرزا غالب کی پیدائش ۸ ربیع الثانی ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء آگرے میں ہوئی۔  
ان کا پورا نام اسد اللہ بیگ خاں تھا۔ ان کے والد کا عرف میرزا دولہا تھا ان کا میرزا  
نوشہ ہوا۔ ان کے دادا تو قان بیگ خاں سمرقند سے پنجاب ہندوستان آئے تو پہلے لاہور  
میں نواب حسین الملک (میرمنو) کے پاس ملازم ہوئے۔ میرمنو کی وفات پر وہ دہلی پہنچے اور  
نواب ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں کی سرکار سے وابستہ ہوئے اور ان کے قوسل سے  
شاہ عالم کی سرکار میں پچاس گھوڑے، بخارے اور نشان پر ملازم ہوئے اور وہاں سے مظہر  
سلطنت کی ملازمت ترک کر کے مہاراجہ جے پور کے دربار سے وابستہ ہوئے اور وہی سے  
آگرہ چلے گئے۔

مرزا غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ تو قان بیگ کی  
موت کے بعد عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے ملازم رہے۔ وہاں  
سے حیدرآباد میں نواب نظام علی خاں کی ملازمت اختیار کی اور وہاں کی خانہ جنگی سے گھبرا  
کر الور کا قصد کیا۔ وہاں راجہ راؤ بھٹا اور سنگھ سے وابستہ رہے اور وہیں زمینداروں کی ایک  
مقامی لڑائی میں مارے گئے۔ عبداللہ بیگ خاں کی شادی میرزا غلام حسین خاں کیدان  
کی لڑکی عزت النساء بیگم سے ہوئی۔ خواجہ غلام حسین خاں کیدان سرکار میرٹھ کے ایک  
نوبی آفیسر اور آگرے کے عائدین میں سے تھے۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں اپنی سسرال  
میں مرزا دولہا کے نام سے مشہور تھے اور خانہ داماد تھے۔ ان کا اپنا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ان کی

وفات پر راجہ بختاور سنگھ رئیس الور نے ”دو گاؤں سیر حاصل اور کچھ روزہ“ میرزا مرحوم کے لڑکوں کی پرورش کے لیے مقرر کر دیا جو ایک مدت تک جاری رہا۔ لیکن یہ یہ معلوم ہو سکا کہ کب اور کیوں بند کر دیا گیا۔

مرزا عبداللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد ان کے بچوں کی سرپرستی اور دیکھ بھال ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے کی۔ نصر اللہ بیگ خاں کی شادی نذر الدولہ دلاور الملک احمد بخش خاں والی کوہاڑ کی بہن سے ہوئی۔ لیکن ان کے کوئی اولاد نہیں تھی اور پھر جلد ہی ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ چنانچہ غالب اور ان کے بہن بھائیوں کا سہارا صرف نصر اللہ خاں ہی رہ گئے۔ نصر اللہ بیگ خاں خود انگریزوں کی عملداری سے پہلے مرہٹوں کی طرف سے فرانسیسی جنرل Perron کی ماتحتی میں اکبر آباد کے حاکم تھے۔ ۱۸۰۳ء میں جب لارڈ لیک Lord Lake نے اس علاقے پر چڑھائی کی تو مرزا نصر اللہ بیگ خاں نے انہیں نواب احمد بخش خاں کی ایما پر بغیر دفاع کے ہتھیار ڈال دیے اور شہر لارڈ لیک کے حوالے کر دیا جس خدمت کے عوض ان کو انگریزی سرکار میں چار سو سوار کار سالدار بنا دیا گیا اور سترہ سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا اور اس کے بعد مرزا نصر اللہ خاں نے خود سوک اور سونسا لاکھ سوا آدھائی کے دوزخیز پر گئے جو بھرت پور کے نواح میں تھے ریاست ہنگر کے سپاہیوں سے بچھین لیے۔ جنرل لیک نے سابقہ خدمات کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ دونوں پر گئے بھی ان کو تاحین حیات ان کی جاگیر میں دے دیے۔ نصر اللہ بیگ خاں اچانک ماتحتی سے گر کر ۱۸۰۶ء میں وفات پا گئے۔ اس وقت مرزا کی عمر آٹھ برس اور چھ ماہ تھی۔

نصر اللہ خاں کی وفات پر ان کی تاحین حیات جاگیر سوک اور سانسا انگریزوں نے واپس لے لی اور رسالہ بھی توڑ دیا۔ البتہ یہ طے پایا کہ نواب احمد بخش خاں پچاس سواروں کا ایک دستہ برقرار رکھیں گے۔ اس دستے کے اخراجات اور نصر اللہ خاں کے پسماندگان کی پنشن کے لیے یہ حکم صادر ہوا کہ نواب احمد بخش خاں اپنی جاگیر کے لیے جو کچھیں ہزار روپیہ سالانہ دیتے ہیں وہ اس شرط پر معاف کیے جاتے ہیں کہ آئندہ اس کے

چند ہزار روپے اس دستے کی غور و پرداخت پر خرچ کریں گے اور باقی دس ہزار مرزا مرحوم کے خاندان کو بطور پنشن کریں گے۔ لیکن نہ جانے کیسے اس فیصلے کے ایک ماہ بعد ۱۹۰۶ء کو احمد بخش خاں نے لاہور ایک سے ایک خط حاصل کر لیا جس میں درج تھا کہ مرزا نصر اللہ ایک خاں کے متعلقین کو پانچ ہزار روپیہ سالانہ حسب ذیل تفصیل سے ادا کیا جائے گا۔

خوجہ حاجی دو ہزار روپیہ سالانہ، مرزا نصر اللہ بیگ کی والدہ اور تین بیٹیاں ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ، مرزا نوشہ اور میر یوسف برادر زادگان مرزا نصر اللہ خاں مرحوم ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ۔ گویا پہلے دس ہزار کے پانچ ہزار ہوئے اور ان پانچ ہزار میں بھی خوجہ حاجی کو مرزا نصر اللہ خاں کے یا عبد اللہ خاں کے پس ماندگان میں شامل کر کے دو ہزار روپے سالانہ کا حقدار بنا دیا۔ خوجہ حاجی کی اس پنشن میں شمولیت ہی اس مقدسے کی بنیاد تھی جس کے لیے غالب کلکتہ گئے اور ناکام ہونے پر کلکتہ کنٹور یہ کے دربار میں بھی عریض گزار ہوئے لیکن کامیابی میسر نہ ہوئی۔

یہ چند حقائق کا ایک مختصر سا خاکہ ہے جو اکثر ذکر غالب مصنفہ مالک رام سے لیے گئے ہیں اور غالب کے خاندانی ماحول اور ان کی تربیت و فنی نشوونما کا پس منظر پیش کرتے ہیں۔ ان حقائق سے جو امور ابھر کر سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ خاندان ان طالع آزمائی ضد مت گاروں کا تھا جو توکل بخدا ہندوستان کی دھرتوں میں اپنی فنی و جسمانی صلاحیتیں لے کر پہنچا تھا اور زندگی کے تقاضوں کے تحت جہاں کہیں بھی دو چار آسودگی کے لحاظ کا امکان نظر آتا اپنی کمر کھول دیتا تھا۔ چوں کہ اولاد ان کے اپنے آگے پیچھے اگامتی زندگی کی پابندیاں اور قبائلی و اجتماعی رشتوں کی قیود و تقاضے نہیں تھے اس لیے وہ ان ساری اقدار سے وقتی طور پر آزاد تھے جو اخلاقیات کے ضمن میں آتے ہیں۔ چنانچہ وقاداری، دیانت، ایقانے عہد، راستی، حق شناسی جیسی ساری اقدار نہ اس ماحول میں موجود تھیں اور نہ ہی ان لوگوں کا اسلوب حیات ان اقدار کے تعیش کا متحمل ہو سکتا تھا۔ اس ماحول کے سبب سے اہم ترین متحرک اور کارآمد قدر ہوشیاری، موقع شناسی اور حیات پرستی



تھی۔ ہر وہ عمل کہ روح حیات پر قرار رکھے جائز تھا اور ہر وہ حرکت جو پانی سے سر باہر رکھنے میں مدد ہو مباح تھی۔

لیکن یہ تو خاندان کی اور ماحول کی اجتماعی صورت حال تھی۔ انفرادی طور پر دیکھا جائے تو غالب کے دادا کا بھی کوئی خور مخکانہ نہ تھا۔ ان کے حالات میں شاید ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن جب ان کے والد بھی بہ حیثیت خاندان و اماوی مرے، تو یہ صورت حال قدرے غیر معمولی تھے۔ غالب نانہال ہی میں رہے جو اس وقت خاصی حصول شمار کی جاتی تھی۔ ماحول خالص جاگیر دارانہ تھا۔ روک ٹوک کے لیے نہ باپ، نہ چچا نہ بڑا بھائی۔ نانہال کے قریبی عزیزوں میں ماموں کا ہی سراغ نہیں ملتا ہے تو نانا تو پھر دور کی بات ہے۔ امیرتی ہوئی جوانی صورت شکل تھوڑا قامت، اس پر مستزاد حصول کے پس منظر اور شاعر کی افتاد طبع نے اور بھی گل کھلائے۔ غرض

ہموارہ ذوقِ مستی و لہو و سرور و سوز

بیست شعرو شاہد و شمع دسے وقار

غالب نے بھی اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ لیکن ان کے یہ لائق تعلق زیادہ عرصے نہیں چلے تھے کہ زمینی حقائق نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ ان زمینی حقائق میں ایک تلخ حقیقت تو ان کے والد کی خاندان و اماوی سے پیدا ہونے والی صورت حال تھی جس نے ان کی خوشی میں ڈہر گھول دیا تھا اور ان کو اس عزت و وقار سے محروم رکھا تھا جو عام حالات میں کسی شخص کو اپنے باپ کے گھر میسر ہوتا ہے۔ دوسری ان کی مصیبت کی غیر مطمئن صورت حال تھی جس نے ان کی نفسیات پر اثر ڈالا۔ صاحب آثار غالب نے اس جگہ ایک بڑا معقول سوال اٹھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ”یہ ایک معرہ ہے کہ اگر مرزا کی نانہال اس قدر خوشحال تھی اور وہاں انھیں ہر طرح کا عیش و آرام میسر تھا تو انھیں آگرہ چھوڑنے اور نواب احمد بخش یا کسی پھوپھی کا دست نگر ہو کر دہلی جانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تجب انگیز امر یہ ہے کہ اگرچہ جب مرزا شروع شروع میں دہلی گئے ہیں تو ماں انھیں آگرے سے کبھی بکھار

کچھ بھیج دیا کرتی تھیں۔ لیکن اس کے بعد مرزا پر سخت سے سخت مصیبتیں آئیں، ان کا بھائی دیوانہ ہو گیا، قرض خواہوں نے ان کی زندگی اجیرن کر دی، قمار بازی کی وجہ سے انھیں جیل جانا پڑا۔ فریڈک ان پر مصیبتوں اور رنج و الم کے پہاڑ ٹوٹے لیکن ان کے غلطوں میں اس امر کا کوئی نشان نہیں کہ ان کی ناہمال میں سے کسی نے آکر ان کی خبر بھی پوچھی ہو... کیا اس تمام صورت حال سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ہے جا ہو گا کہ مرزا کے لیے ناہمال میں فقط خوشی اور بے فکری نہ تھی، کافیتیں اور باطنی کشمکش بھی تھی۔“ (ص ۳۹)

غرض ان حقائق کو نظر میں رکھا جائے تو مرزا کی نشوونما اور حالات زندگی میں (احساس کمتری) کے نفسیاتی اصول کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ ایک شان دار ماحول میں پیدا ہوئے اور بچے لیکن اس ماحول کے مقابلے میں انھیں اپنی کمزوری اور کوتاہیوں کا احساس تھا۔ خدا نے ہمت بلند دی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ ان کوتاہیوں کی تلافی کی جائے۔ انھوں نے مادی ترقیوں کے لیے فضا ناسازگار سمجھ کر اوجھڑے آنکھیں بند کیں۔ بزرگوں نے جو میراث چھوڑی تھی اس پر قناعت کی اور اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے شعر و سخن کا راستہ چنا تاکہ اس میں اتنی شہرت اور ناموری حاصل ہو جائے کہ اپنے ہم چشموں میں سے کسی سے کمتر نہ رہیں۔ چنانچہ خود اپنے ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں:

”آہ از من کہ مرا زیاں زدہ و سوسلہ خرمن آفریدند۔ نہ ہا نہیں نیا گاہن  
خویش سلطان حکمر دارائے کلائے کمرے و نہ بفرہنگ فرزائیکان، بوطی آسا  
علم و ہنرے۔ کفتم دردیش باشم و آزادانہ راہ سپرم۔ ذوق سخن کہ ازلی  
آوردہ بود و ہرنی کرد و مراں ہداں فریفت کہ آئینہ زد و دن و صورت معنی  
مردون نیز کار نمایاں است۔ سر لشکری و دانشوری خود نیست۔ صوفی  
گری بکوار چہ سخن گری روی آر۔ تا گزیر ہم چنان کردم و سفینہ در بحر  
شعر... رواں کردم۔ قلم علم شد و تیر بائے شکستہ آ با قلم۔“ (ص ۴۱)

اپنے اس خیال کو کہ تیر بائے شکستہ آ با قلم بن گئے، انھوں نے ایک رباعی میں بھی نظم کیا ہے۔

## رباعی

غالب بہ گہر زدودہ زانو ضم  
زاں رو بھٹائے دم تیغ است دم  
چوں رفت سہیدی زدم چنگ بہ شعر  
شد تیر خلعت نیاگاں قلم

غالب نے شعر و سخن کے راستے کا انتخاب محض دوستوں کی ترفیب یا احباب کی تشویق پر نہیں کر لیا۔ بلکہ انھوں نے اپنی فطری صلاحیتوں کا اور اس وقت کی دہلی کے ماحول کا اچھی طرح جائزہ لے کر یہ فیصلہ کیا۔ یوں تو غالب شادی سے پہلے بھی دہلی آیا جایا کرتے تھے لیکن جب شادی کے بعد دہلی آئے تو یہ وہ وقت تھا جب مرہٹوں کا زور ٹوٹ چکا تھا اور انگریزی نظم و نسق قائم ہو چکا تھا جس کے چبھتے میں دہلی اور دہلی کے اطراف امن و امان تھا اور ایک بار پھر یہاں کی بھلی زندگی خود کراچی تھی اور ملٹی و ادبی سرگرمیوں کی گہما گہمی تھی۔ شہر کی آبادی میں اضافہ ہو گیا تھا اور علم و فن کا نکھر ہوا شیرازہ دوبارہ بندھ ہو گیا تھا۔ بقول حالی کے ”دارالخلافت دہلی میں چند ایسے ہا کمال جمع ہو گئے تھے جن کی محبتیں اور چلے عہد اکبری و شاہ جہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتے تھے۔“ صاحب آثار غالب نے اس دور کو انگلستان و مغرب کی دو مشہور و معروف تحریکوں Renaissance اور Reformation کے مماثل و متوازی قرار دیا ہے۔ انگلستان میں چھاپہ خانہ کی ابتدا سولہویں صدی میں ہوئی اور اس ہی کے باعث علم عام ہوا۔ دہلی میں بھی چھاپہ کا آغاز قریب قریب اسی دور میں ہوا اور اس نے اشاعت علم میں اہم کردار ادا کیا۔ نثار ثانیہ کا اہم واقعہ انجیل کا انگریزی میں ترجمہ ہے۔ ہندوستان میں بھی یہ کام شاہ ولی اللہ نے قرآن پاک کا پہلی بار فارسی میں ترجمہ کر کے کیا۔ Renaissance میں جس طرح عام ملکی زبانوں کی مقبولیت کو ترقی ملی ہانکل اسی طرح ہندوستان میں یہ کام فارسی اور عربی کے مقابلے میں اردو نے کیا۔ دہلی کے علما و فضلا نے اردو کی بھرپور گیرائی کو محسوس کر کے اپنی توجہ اردو کی جانب مبذول کر دی اور اس ضمن میں شہرہ آفاق اقدام شاہ ولی اللہ

کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین نے قرآن کا اردو میں ترجمہ کر کے کیا۔

یوں تو قرآن پاک کے فارسی اور اردو تراجم بھی اشاعتِ علم ہی کے اقدامات تھے لیکن عمومی تعلیم کی اشاعت اور عمومی درس و تدریس کی ترقی میں جو بے مثال بیدار مغزی اور صحیح قوت فیصلہ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے دکھائی اس کی مثال مشکل ہے۔ چنانچہ جب دہلی میں انگریزی سرکار نے دہلی کالج قائم کیا اور وہاں وطنی کے اکثر غنا اور اکثر مسلمان امرا کو وہاں اپنی اولاد کی تدریس میں شامل ہوا تو شاہ صاحب نے بڑی شدت سے وہاں تعلیم کے تحفظ کی حمایت کر کے مسلمانوں اور خصوصاً اونچے طبقے کے امرا کی ذہنی غفلت کو دور کیا جس کے نتیجے میں اس فیض کے دریا نے آہستہ آہستہ بہتا اور تکتے اطراف کو سیراب کرنا شروع کر دیا۔ دہلی کالج کا قیام علی گڑھ کالج سے پچاس سال پہلے عمل میں آیا۔ چوں کہ سرسید خود یہاں زیر تعلیم رہے تو میرے خیال میں علی گڑھ کا سارا بیرونی اثر انہوں نے دہلی کالج ہی سے تیار کیا۔ دہلی کالج کے معیارِ تعلیم اور وہاں سے اساتذہ کے معیارِ علم کا اندازہ سرسید، ذکاء اللہ، حالی، نذیر احمد وغیرہ ہم جیسے کامرانِ فن سے لگایا جاسکتا ہے جنہوں نے اس درس گاہ سے تحصیلِ علم کی۔

اس دور کی علمی سرگرمیوں کا منظر نامہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل کی تحریکِ اصلاحِ دین کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس تحریک کو دہلی تحریک بھی کہا جاتا ہے اور سرسید نے اس کو مارٹن لیوٹر کی Reformation سے مماثل قرار دیا ہے۔ یہ وہ تحریک تھی کہ جس میں اس دور کا ہر صاحبِ علم و فکر مسلمان اس کے حق میں یا اس کے خلاف شریک تھا۔ اور باوجود اس کے کہ عمومی طور پر شعرا کو دین اور دینی مسائل کی بات کیوں سے لاتعلق ہی گردانا جاتا ہے، اس دور کے تمام اکابر شعرا بھی کسی نہ کسی طرح اس تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ شاہ نصیر، مومن، غالب اپنے اپنے طور پر اس تحریک کے حق میں یا مخالف رائے رکھتے تھے۔ مقلدین میں مولوی فضل حق تھے اور نصیر مقلدین میں شاہ اسماعیل اور سرسید احمد خاں۔ مومن خود سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔ غالب نے بھی ان مباحث میں ایک حد تک عملی حصہ لیا۔ چنانچہ اس تحریک سے تعلق جو

اہم ترین بات ہے تو وہ یہ کہ غالب کا نقطہ نظر غیر تقلیدی اور شاہ اسماعیل سے ہم آہنگ تھا باوجود اس کے کہ ان کا ربط ضبط اور تعلق خاطر مولوی فضل حق سے جو مقلدین کے سرگرم ترجمان تھے، بہت زیادہ تھا۔ صاحب آثار غالب نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جس طرح مرزا غالب نے شاہ اسماعیل کو مذہب میں تقلید کے خلاف جہاد کرتے دیکھا اس نے ان کی طبیعتی آزاد خیالی کو اور بھی واضح کر دیا اور اس ہی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے بھی فن لغت نویسی اور فن شعر کوئی میں استادوں پر آزادانہ نکتہ چینی کی اور کہا کہ ”اگلے جو کچھ کہہ گئے ہیں وہ سب گھج نہیں۔ ہر غلطی کثیر مصلحت مستقیم نہیں ہوتی۔“ (ص ۵۱۔ آثار غالب۔)

آگرے کے قیام میں مسرتین کے طرز و طبع کی غالب نے پروانہ کی اور وہ ان کو ”جابل“ ہی تصور کرتے رہے۔ لیکن دہلی کے قیام میں اہل علم و صاحبان ذوق سے قریبی تعلق، ہم چشم، باذوق اصحاب کی روک ٹوک، علم و ادب کے معیاری ماحول اور پھر فارسی شعرا کے باقاعدہ مطالعہ نے انھیں اپنے اسلوب پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں ان کی وہ چمٹی جس جس نے ان کے آباد اجداد کو زمانے کے سرد و گرم میں زندگی کی راہ بتائی تھی، یکا یک جاگ اٹھی اور چن چن کر وہ جانتے تھے کہ میرے پاس زندہ رہنے کے لیے صرف حار و سردی ہی ہے، اور اس ماحول میں اگر اپنی انفرادیت برقرار رکھنی ہے، ہم چشموں کے شانہ بشانہ چلنا ہے اور اپنے مطلوبہ انتخاب کردہ طبقے ہی میں زندگی گزارنی ہے تو اپنے اسلوب نگارش کو تبدیل کرنا ہوگا۔ ورنہ خود پیدل کی طرح فنا ہو جاؤ گے اور کہیں نشان باقیات نہ ملے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ آگاہی انھیں رفتہ رفتہ ہی ہوئی ہوگی اور یہ فیصلہ انھوں نے خواب میں کوئی تجارت پا کر نہیں کیا ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی میں انھوں نے اپنے اسلوب کے دفاع میں آگرے میں کئی کئی رباعی کو قد رے تبدیل کر دیا۔ یعنی:

مشکل ہے زبں کلام میرا اے دل  
ہوتے ہیں ملول اس کو شن کر جابل  
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش  
کویم مشکل و گرنہ کویم مشکل

اس کے دوسرے مصرع کو تبدیل کر کے "من سن کے سنخودان کامل" کر دیا۔ اس تبدیلی سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ اب انھیں اپنے معترضین کی بات میں حقیقت اور سچائی بھی نظر آنے لگی اور ان کی فتنہ طم پر ان کا احتیاد بھی بحال ہو گیا۔ اور پھر وہ قاری کلاسیک شعرا کی بیرونی کو بھی راست روی تصور کرنے لگے۔

۔ ہرزہ مشتاق دہنے جاوہ شناساں ہر دار

اسے کہ دردام سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

"گل رحمت" میں شامل دیوان رشتہ کے متعلق آزاد (صاحب آب حیات) کا بیان ہے کہ یہ انتخاب مولانا فضل حق اور مرزا خانی کو تو ال دلی نے کیا۔ جب کہ مرزا کے اپنے بیانات اور معاصرانہ تذکروں سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ انتخاب خود غالب ہی نے کیا۔ یہ خیال بھی درست ہی ہو گا لیکن مرزا کی شاعری میں جو عظیم الشان تبدیلی ہوئی اس سے کسی خارجی رجحانی یا دخل کو ہرگز خارج از مکان نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اور بقول غالب انھوں نے اپنا طرز خاص اس لیے ترک کیا کہ اسے "یاروں نے چلنے نہ دیا۔" (جلوہ خطر) دراصل حقیقت وہی تھی جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔ عین پشتوں کے تجربے نے انھیں بتا دیا تھا کہ ان حالات میں زندہ رہنے ہی کے نہیں بلکہ سربراہ آوردہ طور پر زندہ رہنے کا کیا طریقہ ہے۔ سو انھوں نے اپنی متاع شعر و سخن کو اپنا واحد اھمیا رکھتے ہوئے اس سے وہی کام لیا جو احمد بخش خاں نے اپنی دو گلی، انگریزوں سے ساز باز اور اپنی دنیا واری، چالاکی اور ہوشیاری سے لیا اور اس طرح نہ صرف یہ کہ اپنے دور میں طبقہٴ امراء خواص سے منسلک رہے بلکہ بادشاہ تک سے قرب خاص کے دعوے دار ہو گئے اور دنیائے شعر و ادب میں اپنے لیے ایسا بڑا شان و شوکت ایوان تعمیر کیا کہ جس کی آب و تاب رہتی دنیا تک قائم رہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے پر چون کمار دوما کی رائے بھی دیکھ لیں کہ وہ اس تبدیلی کو کس نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنی مشہور تصنیف "غالب شخصیت اور عہد" میں تحریر کرتے ہیں "تاہم آخر الامر ایسا لگتا ہے کہ اس وقت جب کہ وہ دنیائے شاعری میں

نئے نئے متعارف ہو رہے تھے، انھوں نے رائے خانہ کو خاطر میں نہ لانے کے اپنے رجحان کو حد سے زیادہ اہمیت دے کر اپنی ادبی پے برائی کو خطرے میں ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ ایک مصافی مصالحت بھی تھی اور نکتہ چینوں کے طور و تعریض کی ایک حد تک معقولیت کا ہادل یا خواستہ اقرار بھی۔“ (ص ۱۱۹) گویا انھیں زندہ و تابندہ رہنے کے لیے اور اپنی متاع کو فنا ہونے سے بچانے کے لیے یہ مصالحت لازمی تھی۔ سو وہ مصالحت انھوں نے بڑے ہذو مذ سے کی اور جریدہ عالم پر اپنے لیے نقش دوام چھوڑ گئے۔ ہم اس کو چاہے ان کی ترقی پسندی سے تعبیر کریں یا بیدار مغزی سے، فراست سے یا ذکاوت سے حقیقت میں یہ ان کی وہی چھٹی حس تھی جو ان کو ان کے بزرگوں سے ورثہ میں ملی تھی اور جو عمومی طور پر تحفظ ذات کے لیے فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے۔

انشائے غالب کے عنوان کے تحت صاحب آثار غالب نے غالب کی اس بیدار مغزی اور ترقی پسندی کا ایک اور بھی ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ انھوں نے تقریباً ۲۸ سال کی عمر میں اپنے عزیز دوست اور برادر نسبتی علی بخش خاں کے لیے ان کی استاد پارسی مکتوب نگاری پر جو مختصر رسالہ صرف تین دن میں تحریر کر کے مکتوب نگاری کا ایک انتہائی ترقی پسند دستور العمل پیش کیا اس سے بھی ان کی ذہنی پختگی اور بیدار مغزی کا ثبوت ملتا ہے۔“ اور اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خط و کتابت کا جو نقیض اسلوب مرزا نے تیس برس بعد اردو زبان میں اختیار کیا اور جس سے ان کے اکثر فارسی خطوط عاری ہیں اس وقت بھی انھیں پسند خاطر تھا۔“ یہاں ایک انتہائی معقول سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب غالب نے اٹھائیس سال کی عمر میں خطوط نگاری کا ایک ترقی یافتہ دستور العمل خود مرتب کر دیا تھا تو انھوں نے اس پر تیس سال تک عمل کیوں نہیں کیا۔ بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ ہجرت پور کے محاصرے میں جب وہ جنرل کا مہر مہر کے لشکر کے ساتھ اپنے سالے علی بخش خاں اور پچا سہرا احمد بخش خاں کی صحبت میں یہ دستور العمل مرتب کر رہے تھے اور ابھی اس دستور العمل کی سیاسی شک نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے سفر نکلتے کے دوران اپنے خطوط میں

اس دستور العمل کی کھلی خلاف ورزی شروع کر دی اور یہ خلاف ورزی ہمہ شدہ و مدہ آئندہ ہمیں سال جہادی رہی تا وقتیکہ انھوں نے خود اردو میں مکتوب نگاری کا ایک نیا اسلوب جو سلاست بیان اور راست مدعا نگاری میں ان کے دستور العمل سے ہم آہنگ تھا، اختیار نہیں کر لیا۔ اس سوال کا جواب چوں کہ قدرے طویل اور ذریعہ نظر مقالے کے محیط سے باہر ہے اس لیے فی الوقت اس سے صرف نظر کر کے ہم اپنی توجہ عالم کی طبیعتی انفرادیت، ترقی پسندی، بیدار مغزی، حیات پرستی، فراست و ذکاوت تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ ان کی طبیعت کی یہ خصوصیات ثابت کرتی ہیں کہ وہ ذاتی طور پر اپنے وقت سے بہت آگے تھے۔

اس ترقی پسندی کا پہلا مظہر تو ان کی انفرادیت اور جدت پسندی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ لڑکپن میں ان کا رجحان ظہور ترقی اور بیدار تھی جیسے شعرا کی طرف تھا۔ اردو کی ابتدائی شاعری بھی اس ہی انفرادیت اور جدت پسندی کا شاخسار تھی۔ پھر یہ جدت پسندی اور انفرادیت بھی اس انتہا کی تھی کہ فکری میدانوں کو پار کر کے خارجی دنیا پر بھی حاوی تھی۔ ان کی بول چال میں نشست و برخاست میں، لباس میں، کھانے پینے میں غرض یہ کہ ان کے اکثر خارجی رویے بھی عمومی رویوں سے بالکل مختلف اور منفرد تھے۔ وہ اس وقت پاپاخ اوڑھا کرتے تھے جب کوئی دوسرا انھیں اوڑھتا تھا۔ وہ لنگی جو وہ سر پر باندھتے تھے وہ بھی عام دلی دالوں کی طرز سے مختلف ہوتی۔ انھوں نے اپنے چہرے کی ہیئت میں بھی دوسروں سے ہمیشہ امتیاز رکھا۔ یعنی جب ڈانسی رگی تو سرمندہ وا دیا۔ انھوں نے سرسید کو اس وقت آئین اکبری کی تصحیح پر تقریب لکھنے سے انکار کر دیا جب کہ ان کے ذاتی تعلقات نہ صرف سرسید سے بلکہ ان کے خاندان سے نہایت گہرے تھے اور ان کے اس کام کو یک لخت مسترد کر دیا۔ اور مسترد صرف اس اصول پر کیا کہ انگریزوں کے بنائے ہوئے آئین و قوانین و ایجادات کے سامنے پچھلے سارے آئین تقویم پارینہ ہو چکے ہیں اور اس انکار پر لوگوں سے آفریں طلب بھی ہو۔

۔ گر بدیں کارش بگویم آفریں

جائے آں دلدرد کہ ہم آفریں



غالب کی جذبات پسندی کو مزید ممیزان کے سفر و قیام کلکتہ سے بھی ملا۔ وہاں انھوں نے ایک منظم معاشرہ دیکھا، ڈاک و تار کا نظام دیکھا دفائی جہاز دیکھے اور انگریزوں کے قائم کردہ تعلیمی اداروں کو پورے زور شور سے کام کرتے دیکھا۔ سر ڈکن نے ۱۷۹۱ء بنارس میں ہندو سنسکرت کالج کی بنیاد رکھی تھی۔ ۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلزلی نے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی۔ آگرہ کالج ۱۸۲۳ء میں قائم کیا گیا اور بعد میں بمبئی، بنگال اور مدراس تینوں پریزیڈنسیوں میں یونیورسٹی کی ابتدا ہوئی۔ ۱۸۲۳ء سے ۱۸۸۷ء تک دہلی کالج دانشِ جدید کا مرکز بن گیا۔ سی ایف ایڈمز یونز کہتے ہیں ”کالج میں اردو، عربی اور فارسی ادب کے لیے ایک علاحدہ اور فیصل یعنی مشرقی شعبہ بھی تھا جس کو ۱۸۳۸ء تک اپنے نصاب کی جامعیت کے لحاظ سے انگریزی شعبے سے برابری کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ یہ شعبہ نہایت مقبول تھا اور جدید انگریزی علوم کی تحصیل کے لیے طلبہ ان جماعتوں کو جہاں ذریعہ تعلیم اردو تھا چھوڑتے نہیں تھے۔ فارسی اور عربی میں طلبہ کی جس معیار تک رسائی ہوتی تھی وہ بہت اونچا تھا۔ ممتاز مشاہیر ادب مثلاً نامور شاعر الطاف حسین حالی اردو کے مسلم الثبوت نثر نگار، نذیر احمد، عربی کے ممتاز فاضل مولوی، ضیاء الدین مورخ اور بے شمار تصانیف کے مترجم مولوی ذکاء اللہ اور ادبی تنقید کی کتاب ’آبِ حیات‘ کے مصنف محمد حسین آزاد کا تعلق اسی مشرقی شعبے سے تھا۔ تعلیمِ جدید کی اس پلغار نے غالب پر واضح کر دیا کہ اولاً فارسی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ دوم اسلوبِ نگارش میں اب سلاست کا دور آنا وقت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اور قائم و دائم اور زندہ و پائندہ رہنے کے ابدی قانون کے مطابق انھوں نے اپنے مرتبہ دیوان سے دو ٹکٹ نکال کر وقت کی ہدایت کو قبول کر لیا۔ چنانچہ کلکتہ کے قیام کے دوران ان کے ایک عزیز دوست سراج الدین احمد کے ایما پر، جن کا اخبار آئینہ سکندری سے بھی تعلق تھا اور جن کے نام غالب کے بہت سے فارسی مکتوبات ہیں یہ انتخابِ کلامِ اردو فارسی عمل میں آیا اور اس انتخاب کا نام گل رعنا رکھا گیا۔ چوں کہ اردو دیوان ان کے سفر کلکتہ سے پہلے ہی مرتب ہو چکا تھا، اس لیے اردو انتخاب ردیف وار بھی ہے اور جن

غزلوں پر مشتمل ہے ان کی تعداد بھی زیادہ یعنی ۷۱۱ ہے۔ اس کے مقابلے میں فارسی کلام کا دائرہ بہت محدود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سفر کے زمانے تک انھیں فارسی میں شعر گوئی کی طرف توجہ زیادہ ہوئی ہی نہیں تھی۔“ (ذکر غالب۔ مالک رام ص ۱۶)

آئیے اب غالب کے دوسرے فیصلے کو دیکھتے ہیں۔ یعنی آغا میر سے ملاقات کو۔ ”مرزا جب گھسٹو پیچھے تو وہاں غازی الدین حیدر بادشاہ تھے۔ اپنے والد نواب سعادت علی خاں کی وفات کے پانچ سال بعد تک وہ نواب وزیر ہی کہلاتے رہے لیکن ۱۸۱۸ء میں لارڈ مینٹگو نے شاہ دہلی کی کسی بات سے بگڑ کر نظام حیدر آباد اور نواب وزیر اودھ کو بادشاہ کا خطاب اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ حضور نظام نے مغلیہ بادشاہ کے احترام کے خیال سے نہ مانا لیکن غازی الدین حیدر نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور ۱۸۱۹ء میں بڑی دھوم دھام سے ان کی تخت نشینی ہوئی۔ جس کی تاریخ نے تاریخ کبھی۔ بکواسج کہ عس اللہ گردید۔۔۔ جب غالب گھسٹو پیچھے تو بادشاہ کی خدمت میں بازیابی کے لیے انھیں نائب السلطنت معتمد الدولہ آغا میر کی مدد کی ضرورت تھی جنھوں نے آغاز ملازمت خانہ سال کی حیثیت سے کیا تھا لیکن نواب حکیم اور ریز پڈنٹ کی مدد سے بادشاہ پر اس قدر اقتدار حاصل کر لیا تھا کہ اب وہ سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ جیسا کہ غالب کے خطوں سے پتا چلتا ہے ان کی نیابت تاریخ اودھ کا ایک نہایت تاریک باب ہے۔ مرزا نے ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ایک نثر صنعت تھلیل میں لکھی۔ لیکن اس نثر کے پیش کرنے کی نوبت نہ آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ملاقات کے لیے غالب نے جو شرطیں پیش کیں انھیں مرزا باعث شرم و خلاف خود داری سمجھتے تھے۔ چنانچہ خود اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔“ آئندہ باب ملازمت قرار یافت خلاف آئین خود بخشن داری و جنگ شیوہ خاکساری یوز۔“ مرزا بقول خود اس وقت نو آسوز شیوہ گدائی تھے اور شاہان اودھ کی تعریف میں سے پہلا قصیدہ جو انھوں نے لکھا ہے اس میں بار بار اس امر کی طرف اشارہ ہے۔

ناز پرودہ خلوت گر آزاد گم

کافر مگر ہوا سلطان رفتم

من ہم از خیل کریمم و ثلثت نبو  
گر بدرجہ بدرگاہ کریمیاں رفتم

(آغا غالب شیخ محمد اکرام۔ ص ۱۷)

لیکن اس ضمن میں مالک رام، حالی کا حوالہ دیتے ہوئے "ذکر غالب" میں یہ تحریر کرتے ہیں "مرزا آغا میر کی خدمت میں جانے کو تو راضی ہو گئے لیکن بقول حالی انھوں نے اس کے ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ اول میرے پہنچنے پر آغا میر میری تعظیم دیں یعنی اپنی جگہ کھڑے ہو کر پذیرائی کریں۔ دوم یہ کہ مجھے فقہ غزوینے سے معاف رکھا جائے۔ بلکہ غالب یہ چاہتے تھے کہ آغا میر ان سے معاف بھی کریں۔" ملاحظہ سلطان صورت "آغا میر اعزاز و اکرام کی اس حد تک جانے پر راضی نہ ہوا۔ آخر مرزا اس سے کم کو آئین خوشن داری کے خلاف اور شیوہ خاکساری کے لیے تنگ خیال کرتے تھے اس لیے ملاقات نہ ہو سکی۔" (ص ۶۱)

پون کمار دور اپنی مشہور تصنیف "غالب شخصیت اور عہد" میں اس ملاقات کی بابت لکھتے ہیں۔ "سرتیوں کو چھٹی کی طرف سے شرطوں کا عائد کیا جانا اچھا نہیں لگتا۔ ایسا لگتا ہے کہ نواب سے ملاقات کی کوئی شکل نہ نکلنے کے بعد غالب کو اس مہم سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی۔ یہ واقعہ غالب کی زندگی میں سر پرستانہ اداؤں کے سرچشموں کی تعظیم و تکریم پر آمادہ کرنے والی ان کی مالی حالت اور ایک شاعر اور طبیب امرا کے رکن کی حیثیت سے اپنی قدر و قیمت پر ان کے اس یقین کفری کے درمیان کش مکش کی بہت اچھی مثال پیش کرتا ہے جس کی رو سے غلامانہ ذہنیت کا کوئی بھی اظہار ان کے لیے باعثِ وقت تھا۔ یہ کش مکش اکثر انھیں اظہار احرام میں جھکنے کے تمام مراحل سے گزارتی لیکن کچھ آخر میں وہ پھر سیدھے کھڑے ہو جاتے۔" میرے خیال میں اس ملاقات کی ناکامی پر اس سے بہتر شرح نہیں ہو سکتی۔

اب آجے غالب کے آٹری فیصلے پر نظر ڈالتے ہیں۔ اس واقعے کے بارے میں صاحبِ یادگار غالب تحریر کرتے ہیں۔ "تذکرہ آب حیات" میں لکھا ہے کہ جب ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا۔ مسٹر جاسن سیکرٹری گورنمنٹ ہند مدرسن کے

امتحان کے لیے دہلی آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ ماہوار کا ایک عربی مدرسہ کالج میں مقرر ہے اسی طرح ایک فارسی کا مدرسہ مقرر کیا جائے۔ لوگوں نے مرزا غالب، مومن خاں اور مولوی امام بخش، کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے مرزا کو بلا یا گیا۔ مرزا پاگل میں سوار ہو کر صاحب سیکرٹری کے ڈیرے پر پہنچے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی۔ انھوں نے فوراً بلا لیا۔ مگر یہ پاگل سے اتار کر اس انتظار میں ٹھہرے رہے کہ دستور کے مطابق صاحب سیکرٹری ان کو لینے آئیں گے۔ جب بہت دیر ہو گئی اور صاحب کو معلوم ہو گیا کہ اس سبب سے نہیں آئے تو وہ خود باہر چلے آئے اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں آئیں گے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائے گا لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا۔ مرزا صاحب نے کہا کہ گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔ صاحب نے کہا ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔ مرزا نے کہا مجھ کو اس خدمت سے معاف رکھا جائے اور یہ کہہ کر چلے آئے۔“ (ص۔ ۲۹ یادگار غالب) صاحب آغا غالب نے بھی یہ واقعہ سن دین اسی طرح نقل کیا ہے بجز اس کے کہ انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ غالب نامن سے ملنے کہاں پہنچے۔ یعنی وہ جگہ جہاں وہ ملنے گئے وہ ان کا دفتر تھا یا بقول حاتی ”سیکرٹری صاحب کا ڈیرہ“۔ البتہ مالک رام نے ”ذکر غالب“ میں اس واقعہ کا سنہ ۱۸۴۰ء لکھا ہے اور حاشیہ میں اس حقیقت کی صراحت بھی کی ہے کہ حاتی نے آزاد کا لکھا ہوا سال نقل کر دیا ہے جو غلط ہے۔ صحیح ۱۸۴۰ء ہی ہے جو ”مرحوم دہلی کالج“ میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔ اس بات کے علاوہ وہ دوسری اہم بات یہ کہ انھوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ ”یعنی مرزا غالب اگلے دن ان کے ہنگامے پر پہنچے“۔ گویا وہ جگہ جہاں غالب ان سے ملنے پہنچے وہ سیکرٹری نامن کی اقامت گاہ تھی کالج کا دفتر نہ تھا۔ یہ تفصیل اس لیے ضروری ہے کہ دونوں جگہ پر استقبال کے مختلف آداب ہیں۔ باقی تفصیلات دوسرے سوانح نگاروں کے ہاں بھی وہی ہیں جو حاتی نے یادگار غالب میں بیان کیں۔

نامن کے رویے پر میرا ذاتی ردعمل تو یہ ہے کہ اس کا رویہ دنیا کی مسلمہ اور مہذب

اقدار و آداب کے ہانکل خلاف تھا اور وہ اس لیے کہ غالب ان سے ملاقات کے لیے ان کی جائے اقامت پر گئے تھے۔ اگر وہ جگہ سرکاری دفتر ہوتی تب تو شاید ناسن کے رویے کا کوئی جواز نکلتا تھا جب کہ اس صورت میں ہرگز نہیں نکلتا۔ مزید برآں میں یہ کہنا بھی پسند کروں گا کہ یہ ”صاحب لوگ“ جو ایک نئے معاشرے کی بنیادیں استوار کر رہے تھے ایک ذوال آسٹا جاگیردارانہ معاشرے کی پرانی اقدار سے بھی آسٹا تھے اور ان کو لندن سے ہندوستان آنے سے بیشتر زبان و ادب ہی نہیں برسوں یہاں کے ادب و آداب بھی سکھائے جاتے تھے۔ جب وہ یہاں کی سماجی اقدار سے کلیتہً واقف تھے تو ان کو غالب کے علمی و ادبی مرتبے کو طوطا خاطر رکھتے ہوئے وہ ساری رعایات دینی چاہیے تھیں جس کے وہ حق دار تھے۔ اب غالب کی طرف سے دیکھا جائے تو ان کا فیصلہ سو فیصد درست تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اپنے معاشرے میں ایک نامور شاعر کی حیثیت سے تو وہ کسی مرتبی کی سرپرستی یا طلبہٴ آسرا میں سے کسی کی کفالت قبول کر سکتے تھے لیکن کسی کالج میں ملازم ہو کر مدرس کا تصور ہی چوں کہ نا آسٹا اور اجنبی تھا اس لیے اس کو وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

یہاں انتہائی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صاحب آثار غالب کے ان الفاظ پر جو انھوں نے اس واقعہ کے نفسیاتی تجزیے کے طور پر لکھے ہیں اس مقالے کو ختم کیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں ”بعض لوگ حیران ہیں کہ مرزا جو عام مجلسوں اور معمولی حصد یوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے اور غوثانہ و حلق کا کوئی پہلو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے وہ حکومت ہند کے ایک اعلیٰ عہدیدار کے استقبال نہ کرنے سے کیوں اس قدر چراغ پا ہو گئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرزا مدحیہ قصائد میں جو ایک طرح کا مبالغہ روا رکھتے اس کو وہ ایک شاعرانہ رسم سمجھتے تھے جسے شروع سے سب شاعر ناپتے آئے ہیں اور انگریز افسروں کی تعریف میں ان کے قصائد منظوم عربیاں ہیں جنہیں زیادہ موثر بنانے کے لیے مرزا نے بجائے نثر کے نظم میں لکھا ہے۔ وہ طبعاً خوددار و حساس تھے اور خاموشی اعزازات کی ایک بات پر جان دیتے تھے اور اس لیے ہر وہ عمل جو ان کے معاشرتی منصب کی تکفیل کرتا ان کے لیے قابل برداشت نہ تھا۔“

## کتابیات

- ۱۔ کتابیات نثر غالبؔ ۱۳۸۷ء مطبع نول کشور
- ۲۔ 'غالبؔ شخصیت اور عہد'۔ چمن کمار دیا۔ (ترجمہ ساجد فاروقی) ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد لاہور ۱۹۹۹ء
- ۳۔ 'نثر غالبؔ'۔ مالک دھرم۔ مکتبہ شعراء ادب سن آباد لاہور
- ۴۔ 'جادوگر غالبؔ'۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ ادارہ جادوگر غالبؔ کراچی۔ تیسری بارچائے ۱۹۹۷ء
- ۵۔ '۳۵۰ غالبؔ'۔ شیخ محمد اکرام۔ ناشر: شیخ محمد اکرام۔ محمد علی روزنامہ سنی رچرچ ایجنسی
- ۶۔ 'غالبؔ'۔ کتاب پری گارہ۔ دانیال عیدانی۔ بدون روزنامہ کراچی، اشاعت نول ۱۹۹۸ء

## نیاز فتح پوری کی ”مشکلاتِ غالب“

کراچی کے ایک سینار میں نیاز فتح پوری کی نگارشات برائے فروخت تھیں۔ اس کا اہتمام شاید اردو فکشنری بورڈ نے بطور خاص کیا تھا۔ ان کتابوں میں سے ایک کتاب ”مشکلاتِ غالب“ کہ قیمتاً اور وزناً قابلِ برداشت تھی۔ میں نے بھی خرید لی اور میں اس کتاب کو دیکھا تو حقا پڑھتا رہا اور اس طرح میں نے غالب کے ان منتخب اشعار کی اس شرح سے آگاہی حاصل کی جو نیاز صاحب نے کی تھی۔ اس مطالعے کے دوران بعض جگہوں پر مجھے کچھ اشتباہات نظر آئے۔ بعض جگہ مطالب میں ہماری ہم آہنگی نہیں تھی اور بعض جگہ مجھے نیاز صاحب کی طرزِ فکر ہی سے شدید اختلاف تھا۔ چنانچہ ذیل کے مضمون میں میں نے ان تمام خیالات کا اظہار کیا ہے کہ جہاں مجھے موصوف سے کسی قسم کا بھی اختلاف تھا اور یہ سب ایک عام قاری کی حیثیت سے۔ اس میں نہ کسی قسم کی علمیت کا دعویٰ ہے اور نہ ہی غالب فہمی کا۔ لیکن اردو ادب کے ایک عام طالب علم کی حیثیت سے چوں کہ مجھے بھی اپنی بات کہنے کا حق ہے، سو کہہ رہا ہوں۔

۱۔ ”دُہم نے داد نہ دی تھی دل کی یارب

حیر بھی سینہ بہل سے پڑ افشاں نکلا

غالب نے خود بھی اپنے شعر کی تشریح کی ہے اور کہا ہے ”دُہم تیر کی تو جین پہ سبب ایک رخنہ ہونے کے اور تلووار کے دُہم کی تھیں یہ سبب ایک طاق سا کھل جانے کے ہوتی ہے۔ تیر تھی دل کی داد کیا دیتا وہ تو تھی دل سے گھبرا کر پڑ افشاں اور سرا سیدہ نکل گیا۔

نیاز صاحب نے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے تنگی دل پر بجا طور پر زور دیا ہے کہ پورے شعر میں ساری مضمون بندی و خیال آرائی اس ہی لفظ کے اوپر ہے لیکن اس وضاحت کے ساتھ ہی یہ جملہ لکھ کر "میری تنگی دل کا یہ عالم ہے کہ تیر بھی اس کے اندر سے پروں سمیت نہ نکل سکا اور پروں کو دل ہی میں چھوڑ گیا" اپنی ساری زبان وانی اور شعر جمی کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ میں سمجھ نہیں سکتا کہ یہ جملہ نیاز فتح پوری جیسا شخص کس طرح لکھ سکتا ہے۔ میں یہ بھی ماننے کو تیار نہیں کہ نیاز صاحب پدافتاں کے معنی نہیں جانتے تھے۔ بہر طور میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ "پروں سمیت نہ نکل سکا اور (پڑ) دل ہی میں چھوڑ گیا" کا مفہوم نیاز صاحب نے اس شعر میں کہاں سے داخل کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جملہ نہ صرف یہ کہ انتہائی غیر ذمے داری کا جملہ ہے بلکہ ان کے شایان منصب بھی نہیں۔ جب کہ بات صرف اتنی ہے کہ محبوب کا تیر دل کے پار ہو گیا ہے۔

۲۔ تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا

اڑنے سے خوشتر بھی مرا رنگ درد تھا

اس شعر کی شرح کرتے ہوئے بھی نیاز صاحب نے ایک جملہ غیر ضروری لکھ دیا ہے "کاروبار حیات میں مجھے کبھی خوشی حاصل نہ ہوئی۔" اگرچہ رنگ کے درد ہونے اور زندگی میں کھٹکا لگا ہونے سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے لیکن یہ غالب کے شعر کی شرح نہیں ہوگی۔ مثبت شرح صرف اس قدر ہی ہے کہ میرا رنگ جاگنی میں موت کے ڈر سے درد نہیں ہوا۔ مجھے تو ساری زندگی اپنی موت یاد رہی۔

۳۔ ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب

خون جگر و دیتو مڑگان پار تھا

اس شعر کی شرح نیاز صاحب نے اس طرح کی ہے۔ کہتے ہیں خون جگر صرف مڑگان پار کی امانت تھا اور اسی کے لیے یہ خون بہنا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہوا اور میں نے دنیا کے اور بہت سے غموں میں بھی خون کے آنسو بہائے نتیجہ یہ ہوا کہ جب مڑگان پار



نے اس امانت کا حساب مجھ سے لینا چاہا تو مجھے پھر از سر نو خون کے آنسو بہانا پڑے اور اس امانت کو اس طرح واپس کیا۔

یہ شرح انتہائی Simplistic معلوم ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ محبوب نے شاعر کو کوئی امانت دی اور کہا دیکھو اس کو کہیں اور نہ خرچ کر لینا۔ لیکن دنیاوی ضرورتوں نے شاعر کو اس طرح مجبور کیا کہ وہ امانت خرچ ہو گئی۔ اب جو محبوب نے اپنی امانت مانگی تو شاعر نے (گویا کہیں اور سے ادھار لے کر) اس کا پورا کیا۔ اگر اس ی مہمل خیال کی پیروی کی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ ساری امانت ”دنیا کے دوسرے غموں میں“ پہلے خرچ ہو چکی تھی تو پھر از سر نو خون کے آنسو کس طرح بہائے۔ اس خیال کو مد نظر رکھتے ہوئے یہاں امانت کی شرح اس طرح نہیں ہو سکے گی۔ جس طرح نیاز صاحب نے کی ہے۔ یہاں اس کی شرح صرف اس قدر کافی ہے جتنی حاتی نے یادگار غالب میں کی ہے۔ یعنی یہ کہ خون جگر کا قطرہ قطرہ آنکھوں سے اس طرح بہا دیا گیا (یہ میرے پھر کا خون نہ تھا بلکہ) مڑگان یا رکی امانت تھی جو اس کو واپس کر دی۔

۳۔۔ دماغِ عطرِ حیرا بہن نہیں ہے  
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

نیاز صاحب نے دماغ کے معنی صرف برداشت اور تاب و توان کے لکھے ہیں جب کہ اس کے معنی ذوق اور میلان کے بھی ہیں۔ دوسرے انھوں نے شعر کی تشریح سے پہلے سوال اٹھایا ہے کہ یہاں حیرا بہن کس کا مراد ہے یعنی اپنا یا محبوب کا۔ پھر بعد میں فیصلہ کرتے ہوئے کہ یہ حیرا بہن محبوب کا ہے یہ تشریح کی ہے کہ اگر صبا کی آوارگی حیرا بہن محبوب کی خوشبو کو ادھر ادھر لیے پھرتی ہے تو ہمیں اس کا غم کیوں ہو جب کہ ہم میں اس خوشبو سے لطف اٹھانے کی تاب ہی نہیں۔ میرے خیال میں شعر کی یہ تشریح غالب کے پورے کلام ہی کی حقیقتیں نہیں بلکہ اس پندار کی بھی تو ہیں ہے جو غالب کے کلام کا ایک بڑا وصف ہے۔ غالب نے اپنی کمزوری کا اظہار کر کے نہ عشق میں اور نہ ہی ذاتی زندگی میں جانوی حیثیت پر اکتفا کو ادا کیا۔ چنانچہ شارح سے غالب کے کلام کے بنیادی اوصاف کی

بقا پر اختلاف کرتے ہوئے نیز شاعری میں عشق کی روایات کو مزید نظر رکھتے ہوئے مجھے یہ بات زیادہ قریب قیاس معلوم ہوتی ہے کہ یہاں دماغ کے معنی میلان کے لیے جائیں۔ ان معنی کے ساتھ شعر کا مفہوم زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی مہاجوب کے چہرہ کی خوشبو اذاتی پھرے (اور اغیار اس سے فیض حاصل کرتے رہیں) مجھے کیا غم۔ مجھے یہ خوشبو (جو قسم کشی کی بھی ہو سکتی ہے۔ بے وفائی کی بھی ہو سکتی ہے اور وصل طبع کی بھی) ہی اچھی نہیں لگتی۔

۵۔ ۔ گلہ ہے شوق کو دل میں بھی غلغلہ جا کا

گھر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

شارح نے اس کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ میرے شوق محبت کی شدت و وسعت کا یہ عالم ہے کہ دل جیسی چیز میں بھی (جو وسعت دو جہاں اپنے اندر رکھتا ہے) نہیں سا سکتا تھا لیکن مجبوراً اسے دل کے اندر سانا پڑا۔ گویا یوں سمجھیے کہ ایک اضطراب تھا دریا کا جو گھر کے اندر بند ہو گیا۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ غالب اپنے عشق میں وحشت میں بے چارگی میں، رقابت میں کوئی ثانوی حیثیت قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ چنانچہ ان کی یہی افتاد طبعیت جا بجا ان کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس بنیادی چیز کو آپ ذہن میں رکھیں تو اس شعر کا مطلب عین غالب کی نفسیات کے مطابق کہ ہر کس و نا کس کے ساتھ مرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے یہ ہو گا کہ باوجود اس کے کہ سمندر کا اضطراب (یہاں دریا۔ گھر، آپ گھر جیسے سارے، ملازمت کو نظر میں رکھیں) ایک گھر میں سا جاتا ہے لیکن میرے شوق کی یہ کیفیت ہے کہ دل میں بھی اس کو غلغلہ محسوس ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر میرے شوق کی شدت و وسعت سمندر سے بھی زیادہ ہے۔

۶۔ ۔ کوئی دیرانی سی دیرانی ہے

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

غیاث صاحب لکھتے ہیں ”میں گھر کی دیرانی سے گھبرا کر صراغیا۔ لیکن وہاں بھی وہی گھر کی سی دیرانی دیکھی۔ اس شعر میں بقول جاتی صرف یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ دشت اور گھر کی دیرانی بالکل ایک سی ہے۔ لیکن اس شعر میں حسن اس وقت پیدا ہوتا جب یہ ظاہر کیا جاتا

کہ میرا کمرہ دشت سے زیادہ ویران ہے۔ لیکن لفظ "میں" نے یہ مفہوم پیدا نہ ہونے دیا۔ مجھے پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ اس شعر میں کسی طرح یہ مفہوم پیدا نہیں ہوتا کہ میں کمرہ کی ویرانی سے گھبرا کر صرا گیا۔ یہ پورا جملہ "ایزاد بندہ" سے زیادہ کچھ نہیں۔ رہا سوال شعر کے حسن کا تو میں سمجھتا ہوں کہ اگر کمرہ آبادی کی نشانی ہے دشت سے کہ ویرانی کی علامت ہے، مماثل ہو جائے تو ویرانی کی شدت کا خاطر خواہ اظہار ہو جاتا ہے۔ اتنی کمرہ کی ویرانی کہ دشت سے مماثل ہو اظہار ویرانی کے لیے کافی ہے۔ یہاں یہ بات بھر محظوظ خاطر رہے کہ یہاں بھی غالب نے دشت کو ویرانی میں اپنے کمرہ سے بڑھنے نہ دیا۔ چنانچہ اس کا بہترین مفہوم وہی ہے جو حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے یعنی ہم تو اپنے کمرہ کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی مگر دشت بھی اسی قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر کمرہ کی ویرانی یاد آ جاتی ہے۔

۷۔۔۔ وا کر دیے ہیں شوق نے بنو نقاب حسن

غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

شارح لکھتے ہیں "میرے جذبہ شوق نے حسن کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے اور اب اس کے مطالعے کے لیے اگر کوئی چیز حائل ہے تو صرف نگاہ۔" غرض عا یہ کہ تہا بات حسن دور ہونے کے بعد ہی حسن کا صحیح مطالعہ ہو سکتا ہے۔" اس شرح میں پہلا جملہ تو شعر کی سلیس نثر ہے۔ دوسرا جملہ اس ہی نثر پر ایک کلیہ ہے جو سراسر پہلے جملے کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں۔ اس شرح میں مجھے پہلا اعتراض تو لفظ "مطالعہ" پر ہے اس کی جگہ مشاہدہ زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعر کا مفہوم کیا ہے۔ یہ شارح نے کہیں بیان نہیں کیا۔ دراصل اس شعر کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ذات ہر مشاہدہ حق میں شامل رہتی ہے۔ اس لیے انسان کو معروضی طور پر کبھی تکمل مشاہدہ حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی خیال کو حافظ نے اس طرح ادا کیا ہے۔

میان عاشق و معشوق چچ حائل نیست

تو خود حجاب خودی حافظ از میان بر خیز

۸۔ نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی

سفیدی دیدہ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

شارح نے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے کافی طوالت سے کام لے کر یہ بتایا ہے کہ سفیدی سے یہاں مراد آنکھ کا نور ہے اور کلمی بھی دیواروں پر کی جاتی ہے۔ یوسف کی تشدد کی اور باپ کی خطر آنکھوں کا بھی ذکر کیا ہے لیکن انتہائی قریب کی بات یعنی آنکھیں سفید ہو جانا بمعنی اندھا ہو جانا مذکور نہ ہوا۔ اردو کا یہ محاورہ اس شعر میں لفظ سفیدی کے ایہام کو اور بھی اچھی طرح بیان کر سکتا تھا کہ حضرت یعقوب نے بیٹے کی یاد میں رورو کر اپنی چٹائی کھود دی تھی۔ دوسرے قرآن کی آیت "وَبَيْضَتْ عَيْنُهُ مِنَ الْحُزْنِ" کا ترجمہ بھی یہی ہے۔ اور (حضرت یعقوب) کی آنکھیں غم کے سبب سفید ہو گئیں۔

۹۔ کس کو سناؤں حسرت اظہار کا گلہ

دل فرو جع و خرق زباں ہائے لال ہے

شارح لکھتے ہیں کہ اس شعر کا مفہوم واضح نہیں۔ ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ میں حسرت اظہار کا گلہ کس سے کروں، جب کہ میرا دل ہی اظہار حال سے قاصر ہے۔ اس صورت میں زبان ہائے لال سے خود غالب کی گنگ زبان مراد ہوگی۔ لیکن اگر زبان ہائے لال سے مراد دوسروں سے ہو تو پھر مفہوم یہ ہوگا کہ جب لوگ میرا حال پوچھتے ہی نہیں تو پھر میں حسرت اظہار کا گلہ کس سے کروں۔ زیادہ قرین قیاس یہی مفہوم ہے گو اس صورت میں زبان ہائے لال بہ صورت جمع استعمال کرنے کا کوئی محل نہیں ہے۔

اس تخریج کو پڑھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ "زبان ہائے لال" واقعی فصیح طرز اظہار نہیں لیکن اگر اس کا مطلب وہی لیا جائے جو نیاز صاحب کہتے ہیں تو "زبان ہائے لال" دستور زبان کے لحاظ سے ضروری ہو جاتا ہے اور اس لیے بے محل نہیں ہے۔

اس شعر پر کافی غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یوسف سلیم چشتی نے اس کی جو شرح لکھی ہے وہ بہت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انہونی یا محض

دل خوش کن، خیالی باتوں کو زبانی جمع خرچ کہتے ہیں لیکن کوئی زبانیں اس زبانی جمع و خرچ سے قاصر ہیں۔ پس مطلب یہ ہوا کہ میں اپنی حسرتِ اظہار کا گلہ کس سے کروں کہ میرا دل کونگوں کے زبانی جمع و خرچ کا دفتر ہے کہ ان کے (اظہار کی) آرزوئیں اور تمنائیں سب دل ہی دل میں رہتی ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ چشتی صاحب سے بھی یہاں یہ ایک نکتہ نظر انداز ہو گیا۔ اور وہ نکتہ ایہام پر خیال آرائی سے متعلق ہے جو غالب کی شاعری کا خاصہ ہے اور جس پر خود چشتی صاحب بہت زور دیتے ہیں نکتہ یہ ہے کہ لال وہ بھی کھاتا بھی ہوتا ہے جس پر جمع و خرچ کا حساب لکھا جاتا ہے اور حساب کتاب کی دنیا میں اس کا یہ رنگ صدیوں سے بغیر کسی تبدیلی کے چلا آ رہا ہے۔ پھر زبان اور اس کھاتے میں صوری مماثلت بھی ہے اور آخر میں زبان سے متعلق محاورے مثلاً زبان بند ہونا اور زبان کھلنا بہ جنس کھاتوں کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔

۱۰۔ ہے ہے خدا خواست وہ اور دشنی

اے شوقِ منفعل، یہ تجھے کیا خیال ہے

نماز صاحب اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں "شوقِ منفعل" غور طلب ہے۔ اگر یہ ترکیب تو صغی ہو تو پہلا مصرع بے معنی سا ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ جب شوقِ خود محبوب کے خیالِ دشنی پر منفعل ہے تو پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے کہ "ہے ہے خدا خواست وہ اور دشنی"۔ اس لیے اگر شوق اور منفعل دونوں کو علاحدہ علاحدہ رکھ کر منفعل کے بعد لفظ ہو محذوف تسلیم کرایا جائے تو اہلِ ادب اپنی جگہ ٹھیک ہے اور اس صورت میں مفہوم یہ ہو گا کہ اے شوقِ تیرا خیال کہ محبوب حیراد دشمن ہے صحیح نہیں اور اس بدگمانی پر تجھے منفعل ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے دوسرا مصرع یوں ہو۔

اے شوقِ منفعل ہو تجھے کیا خیال ہے

نماز صاحب کی تشریح سے مجھے شدید اختلاف ہے۔ مجھے شوقِ منفعل میں بظاہر کوئی اشکال نظر نہیں آتا۔ اگر شوقِ منفعل کے وہ معنی بھی لیے جائیں جو انصوں نے لکھے ہیں

تب بھی بات مکمل اور کسی طرح پہلا مصرع بے معنی نہیں ہوتا۔ یہ انفعال شوق تو ہے ہی بدگمانی کی وجہ سے۔ مثلاً اگر میں کہوں کہ ”اے ایمان منفعیل تیرا کیا خیال ہے بھلا حیرا رب تیرے ساتھ دشمنی کرے گا۔“ اس میں مجھے بتائیے اشکال کیا ہے اور کون سا جملہ بیکار یا بے معنی ہے۔ میرے خیال میں تو شوق منفعیل اتنی بلیغ ترکیب ہے کہ جو انسانی توقعات، عشق و محبت کی روایات، ذات محبوب کی خصوصیات اور پھر وقتی جذبات و تخیلات سب پر محیط ہے۔ پھر ایک بات اور بھی ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ انفعال اس دشمنی کی بدگمانی کا نہ کسی اپنی نارسائی کا بھی تو ہو سکتا ہے۔ پھر نیاز صاحب کس طرح کہیں گے کہ پہلا مصرع بے معنی ہو جاتا ہے۔ (دراصل وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ غیر ضروری ہو جاتا ہے) بے معنی کسی صورت میں نہیں ہوتا۔

۱۱۔ عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی کی

میری وحشت تری شہرت ہی کی

اس شعر کے مفہوم میں کوئی اشکال نہیں لیکن نیاز صاحب کہتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں ردیف کا استعمال صحیح نہیں ہوا۔ موقع ”میری شہرت تو ہے“ کہنے کا تھا نہ کہ ”شہرت ہی کی کا۔ بات تو کچھ ٹھیک ہی لگتی ہے۔ غالب کے ہاں کئی جگہوں پر ایسے اشتباہات موجود ہیں۔ مثلاً اوپر کے ایک شعر میں غالب کہتے ہیں کس کو سناؤں حسرت اظہار کا گلہ۔ اب یہ طرز اظہار ہی خلاف محاورہ ہے گلہ سنایا نہیں جاتا کیا جاتا ہے۔ یا غالب کا مشہور شعر ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی

کچھ ہماری خبر نہیں آتی

یہاں لفظ ہماری خلاف محاورہ ہے یہاں اپنی فصیح ہے۔ اسی طرح میری نظر ایک شعر پر ابھی پڑی جو اس طرح ہے۔

ترے خیال سے روح اہتراز کرتی ہے

پہ جلوہ ریزی باد پہ پڑ لٹائی طبع

پہلے مصرع میں ح دزن سے خارج ہے۔ یہ اس قسم کی چیزیں امائدہ کے ہاں بھی مل جاتی ہیں جو ان کی بشریت پر دلالت کرتی ہیں لیکن ان کے منصب کی تکمیل نہیں کرتیں۔

۱۲۔۔۔ نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا

جوش بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

نیاز صاحب کہتے ہیں "اس حسن برق پاش کا نظارہ جس کا نقاب خود بہار ہو کون کر سکتا ہے۔ برق کے استعمال کا کوئی موقع نہ تھا اگر برق حسن کی جگہ جان حسن کہا جاتا تو زیادہ مناسب تھا" لیکن میرے خیال کے مطابق ان معنی کے پیش نظر کہ انسان کی نگاہ بھی ذات حقیقی تک نہیں پہنچ سکتی وہ ہمیشہ مظاہر ہی کو دیکھتی ہے لفظ برق ہی انتہائی بامعنی اور مناسب لفظ معلوم ہوتا ہے۔ یہ لفظ مناسب اس وجہ سے بھی ہے کہ برق کے سامنے چمک چمک جاتی ہے اور مانع نظارہ ہوتی ہے۔

۱۳۔۔۔ اس چشم فسون گر کا اگر پائے اشارہ

طولی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

شارح کہتے ہیں طولی کے سامنے آئینہ رکھ کر اس کو بولنا سکھایا جاتا ہے۔ اس لیے طولی کے ساتھ آئینہ کا ذکر تو درست ہے لیکن خود آئینہ کا چشم فسون گر کے اشارہ پر گفتار میں آ جانا لایینی سی بات ہے۔ آئینہ کا گفتار سے کوئی تعلق نہیں بلکہ سکوت و حیرانی سے ہے۔ آئینہ کی حیرانی و سکوت کا چشم فسون گر کے اشارہ سے گفتگو میں تبدیل ہو جانا عجب بات ہے۔

یہ غالب کا انتہائی خوب صورت شعر ہے۔ چشم، آئینہ، فسون گر، طولی، گفتار، غرض یہ کہ اسنے تلازمات کے ساتھ اتنی خوب صورت بات کہنا ہر ایک کے بس میں نہ تھا۔ یہ صرف غالب کہہ سکتا تھا لیکن مجھے حیرت ہے کہ نیاز صاحب اس خیال کو مہمل کہہ رہے ہیں۔ اگر یہ خیال مہمل ہے تو اردو اور فارسی کی نوے فیصد شاعری مہمل قرار پائے گی اور جو شاعری رہ جائے گی وہ "وہ ان تو درد ہائندہ" کے مصداق ہی ہوگی۔

آئینہ اور طوطی کی رعایت ذہن میں رکھیے۔ اب سوچئے کہ شاعر کہتا ہے کہ اس کی آنکھ ایسی قسوں کر ہے کہ اگر اشارہ کرے تو طوطی تو کیا آئینہ کہ خود مظہر حیرت ہے، بولنے لگے۔ فارسی اور اردو شاعری کی بنیاد اس خیال آرائی پر ہی ہے اگر نیاز صاحب اس کو لایعنی کہتے ہیں تو ان سے غالب کے اشعار کی تفہیم پر بات ہی نہیں ہو سکتی۔ غالب کا کون سا ایسا شعر ہے کہ جو ایسی خوب صورت خیال آرائی سے عاری ہوگا۔ بلکہ اردو اور فارسی کے بہترین اشعار اپنے منصب سے گر جائیں گے۔ مثالیں دے کر میں بات کو طوالت نہیں دینا چاہتا لیکن اس ہی نزل کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔

سائے کی طرح ساتھ پھر میں سرود و صنوبر

تو اس قید دل کش سے جو گلزار میں آوے

نیاز صاحب کا اعتراض اگر اس شعر پر بھی لگایا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ درشتوں کا جو قائم ہوتے ہیں اور اس لیے قیام کی نشانی بھی محبوب کے ساتھ بھرتا ہے معنی دھو بات ہے۔

۱۳۔ نقش ناز بہت طنار بہ آغوش رقیب

پائے طاؤس پئے خلد مانی مانگے

اس شعر کے مضموم کے بارے میں مجھے نیاز صاحب سے کسی قسم کا اختلاف نہیں یعنی یہ تشریح کہ محبوب رقیب کی آغوش میں ہے اور یہ ایسا نکر وہ مظہر ہے کہ اس کی تصویر کھینچنے کے لیے خلد مانی کے بجائے پائے طاؤس چاہیے بالکل درست ہے۔ لیکن چلتے چلتے اس تشریح کا آخری جملہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ "کیوں کہ پائے طاؤس بہت بد نما ہوتا ہے اور تصویر کے نیچے کا حصہ یعنی رقیب کا جسم بھی دیکھا بد نما ہوتا ہے۔" اس آخری جملے نے ساری تشریح کا ستیا ناس کر دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شارح کا تصور "بہت طنار بہ آغوش رقیب" کچھ ایسا ہے گویا محبوب چار سال کا بچہ ہے اور رقیب اس کو گود میں لے کر بازار کے کالے پر دے والے فوٹو گرافر سے تصویر کھینچوا رہا ہے۔ اس حالت میں تصویر کے نیچے کا حصہ بہت بد نما رہ جاتا ہے چون کہ اوپر کے جتنے مجھے میں محبوب ہے وہ غرض نما ہے،



بچے کے حصے میں رقیب کی باتیں ہیں اس لیے وہ بدلتا ہے۔ میں جہاں تک موصوف کے ذہن تک رسائی حاصل کر سکا ہوں کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس کا مطلب کچھ اور ہو۔ بہر صورت اس ساری تخریج میں ”مصرعے“ کی جتنی یہ تصویر کے بچے کا حصہ ہے جو جیتنا کچھ سے بالاتر ہے۔

۱۵۔ ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب

آخر تو کیا ہے، اے نہیں ہے

اس کی تخریج نیاز صاحب نے اس طرح کی ہے اس شعر میں غالب نے ردیف کا استعمال بڑی عمدت کے ساتھ کیا ہے چونکہ اس زمین کی ردیف نہیں ہے اور ساری غزل میں نہیں ہے۔ نہیں ہے کی تکرار کی گئی ہے اس لیے غالب نے اپنا نام ہی ”نہیں ہے“ رکھ لیا۔ اور اسی سے مخاطب ہو کر پوچھ رہا ہے کہ اے تو وہ جو ہر بات میں نہیں ہے۔ نہیں ہے، کہنے کے سوا اور کچھ نہیں کہتا یہ تو تا کہ تو خود کیا ہے۔

اس شعر کی مندرجہ بالا تخریج تقریباً تمام حوالہ شروحوں میں نظر آتی ہے بلکہ حیرت ہے کہ پارے پارے جملے ایک سے ہیں۔ نیاز صاحب نے بھی اکثر وہی جملے نقل کر دیے ہیں۔ مجھے اس شرح میں کلام ہے۔ میرے ذہن کے مطابق اس شعر کے صرف دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ اس کا پہلا مفہوم اگر ضمیر تو کو تم کا واحد گردانا جائے تو یہ ہوتا ہے۔

۱۔ غالب اسی ہستی عدم وجود (بلحاظ انسانی اور اک کے) سے خطاب کر کے کہتا ہے۔ اگر نہ ہستی ہے اور نہ عدم ہے تو اے خدا (جو نہیں ہے) تو تا کہ تو کیا ہے! اے نہیں ہے۔ ”نہیں ہے“ اپنا نام نہیں رکھا ہے بلکہ اس کا نام رکھا ہے کہ جو اس صفت سے نصف ہے۔ یعنی لامکاں ہے۔ موجود و غیر موجود کے اس مہانے میں غالب اپنا نام ”نہیں ہے“ کس طرح رکھ سکتا ہے کہ وہی تو موجود ہے اور سوال کر رہا ہے۔

۲۔ اس شعر کا دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے اور وہ اس صورت میں اگر دوسرے مصرع میں لفظ تو کو ہم ضمیر تصور نہ کریں بلکہ حرف عطف۔ اس طرح پہلے اور دوسرے مصرعے کی تشریح اس طرح ہوگی۔ غالب اگر نہ کچھ ہستی ہے اور نہ کچھ عدم ہے تو اے ”نہیں ہے“ آخر

کیا ہے اس مفہوم میں بھی، "نہیں ہے" غالب نہیں ہے بلکہ خدا ہے۔

۱۶۔ بدگماں ہوتا ہے وہ کافر، نہ ہوتا کاشکے

اس قدر ذوق نوائے مرغِ بستانی مجھے

اس شعر کی شرح نیاز صاحب مرحومہ شرحوں کی طرح یوں کرتے ہیں۔ "نوائے بلبل  
سننے کا شوق مجھے بار بار چمن کی طرف لے جاتا ہے چوں کہ وہ بھی میری ہی طرح زاری و  
نالہ میں مصروف رہتا ہے لیکن میرا محبوب یہ دیکھ کر مجھ سے بدگماں ہوتا ہے لیکن کیوں کہ  
اس کا سبب ظاہر نہیں کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ محبوب یہ خیال کرتا ہو کہ غالب کو صرف  
چمن کا شوق ہے۔ اگر اسے میری صحبت ہوتی تو وہ صحرا کا رخ کرتا کسی گلشن کی طرف کیوں  
جاتا؟"

جہاں تک شعر کی شرح کا تعلق ہے مجھے اس میں کوئی اشتباہ نظر نہیں آتا لیکن جہاں  
محبوب کی بدگمانی کا اظہار کیا گیا ہے وہ نیاز صاحب جیسے ادیب کے شایان شان نہیں۔  
دراصل شاعر کہتا ہے مجھے تو شوق ہم نوائی بلبل (مرغِ بستانی) باغ کی طرف لے جاتا  
ہے لیکن محبوب کو گل کی وجہ سے بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ یہاں جذبہ رقابت گل سے ہے۔

۱۷۔ عالمِ غبارِ وحشتِ بھٹوں ہے سرِ سر

کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

نیاز صاحب لکھتے ہیں "دنیا کو لیلیٰ کے نقطہ نظر سے کب تک دیکھا جاسکتا ہے جب  
کہ وہ دراصل وحشتِ بھٹوں کی غبارِ انگیزی کے سوا کچھ نہیں۔ مدعا یہ کہ دنیا میں ناکامی  
وحشت ہی اصل چیز ہے اور ظاہری مسود و نمائش بالکل بے بنیاد چیز ہے۔"

بھلا سوچے تو یہاں دنیا کو لیلیٰ کے نقطہ نظر سے دیکھنے کا مفہوم کہاں سے پیدا ہوتا  
ہے۔ اور پھر مدعا کے ضمن میں ناکامی وحشت اور ظاہری مسود و نمائش کہاں سے در آتی  
ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ نیاز صاحب نے یہ تفرع انتہائی غیر فوٹے داری سے  
کی ہے اور جو مفہوم بتایا ہے وہ ہرگز ہرگز ان کے شایان شان نہیں تھا۔ یہ غالب کا انتہائی  
خوب صورت شعر ہے جس میں حقیقت و آئینہ کی تصویر کشی ہے۔ طرۂ لیلیٰ ایک

آئیڈیل ہے۔ بلند نظری و بلند فکری ہے جب کہ دنیائے حقیقت غبار و مشہد مجنوں ہے۔ غبار مایوسیوں کا ناکامیوں کا ایک کھنا ہے۔ اور طرزا لیلیٰ فکر بلند کا استعارہ ہے۔ میرے خیال میں طرزا لیلیٰ سے بھتر کھنا یہ کسی عاشق (مجنوں) کی زبان میں انسانی آئیڈیل کا ہو بھی نہیں سکتا۔

۱۸۔ نالہ سرمایہ یک عالم و عالم کف خاک

آساں بیڑہ قمری نظر آتا ہے مجھے

اس کی شرح اس طرح کی گئی ہے ”قمری بھی خاکی رنگ کی ہوتی ہے اور قمری کا اظہار بھی خاکستری ہوتا ہے اس لیے آساں کو بیڑہ قمری قرار دیا۔ اور عالم کو کف خاک، چوں کہ دنیا نام نالہ و زاری اور خاک اڑانے کا ہے اس لیے آساں کو یا بیڑہ قمری ہے جو خاکی رنگ کا ہوتا ہے۔ قمری کی آواز کو بھی نالہ ہی سے تعبیر کرتے ہیں۔

ایک بار مجھے لگا ہے کہ نیاز صاحب نے جو کچھ حدود اولہ شرحوں میں لکھا تھا وہ من و عن نقل کر دیا ہے۔ ورنہ آساں کو بیڑہ قمری کہنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ بات تو مانی جاسکتی ہے کہ قمری خاکستری رنگ کی ہوتی ہے (حالاں کہ میں نے جتنی قمریاں دیکھیں ہیں وہ ساری کی ساری سفید رنگ کی تھیں۔ ممکن ہے ایمان میں خاکستری رنگ کی بھی ہوتی ہوں) لیکن اس کا اظہار بھی خاکستری رنگ کا ہو یہ خلاف واقعہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کالی مرفی کالا اور سرخ مرفی سرخ اظہار دیتی اور سورنی کے اظہار میں بھی وہ سارے رنگ جھلکتے جو اس کے پردوں میں ہوتے ہیں۔ ہاں البتہ خاک سے طرازے کی ایک صورت نکلتی ہے۔ جب مرفی بغیر سرخ سے جوڑا کھائے اظہار دیتی ہے تو اس اظہار کو خاکی اظہار کہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ آساں ایسا ہی خاکی اظہار ہو۔ یعنی One Parent Product، پھر یہ کہ مصرع کا آخری حصہ یعنی ”عالم کف خاک“ بھی توجہ کا طالب ہے۔ بھلا یہ آساں اس عالم سے باہر کی تو کوئی چیز نہیں ہے۔ اس میں شامل ہے۔ تو اس کو بیڑہ قمری کہہ کر کیا مفہوم نکلا ہے۔ میری سمجھ میں تو یہ شرح آئی نہیں آپ سمجھتے ہوں تو مجھے بتائیں۔ چاہے تھا کہ نیاز صاحب بھی جرأت سے کام لے کر کہہ دیتے کہ شعر کجھ میں نہیں آیا۔

قالب کے ایک دو تہیں صبیوں اشعار ایسے ہیں جن کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔  
 فرض یہ چند اشعار تھے جن کی شرح میری نظر میں محل نظر ہے۔ بہت ممکن ہے جو  
 مفہیم میں نے بیان کیے ہیں ان سے بھی لوگوں کو اختلاف ہو جو ہر قاری کا حق ہے۔  
 میں نے بھی اپنے اس استحقاق کو استعمال کرتے ہوئے ہی یہ ساری باتیں کہی ہیں۔  
 چنانچہ اس استحقاق کی حدود میں مفہوم کے اختلافات میرے اور نیاز صاحب کے ہیں وہ  
 اپنی اپنی جگہ کہتا جاتے ہیں لیکن مجھے خاص اعتراض ان معانی اور مفہیم پر ہے کہ جو ایک  
 غیر قسے دارانہ ذہنی رویے کی بنا پر مسلط کر دیے جائیں جب کہ شعر کے الفاظ اور سیاق و  
 سباق دونوں سے کسی طرح ان معانی کی ضمانت نہ ملتی ہو۔ چنانچہ اپنے طور پر میں نے  
 قالب کی تفہیم کی کوشش کی ہے۔ نیاز صاحب کی شرح پر یہ تنقید ضرور ہے ان کی تنقیص  
 پر گز نہیں۔

## غالب کی انشاء نگاری و فارسی نامہ نویسی

انشاء کے لغوی معنی:

لغت نامہ و لغت النہیں انشاء کے کم و بیش گیارہ مختلف معانی دیے گئے ہیں۔ ثبوت میں دنیائے فارسی و عربی کے مستند ترین لغات کے حوالے دیے گئے ہیں اور اس طرح لفظ انشاء میں آفرغش و ایجاد سخن پر دازی، لویہ بندی و تالیق عبارات سے نیکر "خواندن و آوردن شعر از خود سخن" بھی شامل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنے روایتی اور اصطلاحی معنی میں یہ لفظ تخلیقی منشور کے لہجے سے بحث کرتا ہے اور فن شعر گوئی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اب نثر میں یہ تخلیقی قصہ کہانی کو چھوڑ کر 'منشآت'، 'مکتوبات'، 'دعوات'، 'مراسلات'، خطوط اور انشاء لطیف، کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ منشآت لغوی اعتبار سے منطقی کی جمع ہے اور انشاء کا صیغہ مفعول ہے جو مسودات، عبارات، تصنیفات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ آج کی اصطلاح میں ان سے مراد وہ تحریریں ہیں جو ادب عالیہ کہلاتی ہے۔ ان تحریروں میں انشاء پر داز نفس مضمون کو ایسے پُر شکوہ الفاظ، نادر تشبیہ، استعارات اور بلند خیال افکار کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ عبارت میں حسن و تاثیر کے ساتھ زبان وافی، قدرت اظہار اور جزالت بیان بھی نمایاں ہوتی ہے۔ انشاء ابوالفضل اور سرنظر ظہوری ان منشآت کے کلاسیک نمونے ہیں۔

لغوی معنی کے لحاظ سے مکتوب اور منطقی میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن اصطلاحاً مکتوب خط

یا رقعہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اس میں ابلاغ، ترنسل یا ترنسل کا مفہوم یہاں ہوتا ہے جو بظاہر انشاء میں نہیں۔

آج کے اصطلاحی معنی کے مطابق رقصات ذاتی نوعیت کے خطوط پر مشتمل تحریرات کا مفہوم رکھتے ہیں اور اسی سبب ان سے مراد وہ نوشتے ہیں جو بے تکلف اور غیر مصنوعی عبارت پر مشتمل ہوں لیکن مکتوب نگار کا مقصد ترنسل ضرور ہو۔ لیکن ان تحریروں کے لیے کسی اسلوب کی تخصیص لازمی شرط نہیں۔ اس کا انحصار ہر مکتوب نگار کی ذاتی صلاحیت و طبیعت میلان پر منحصر ہے۔ اس لیے ہر رقعہ جہاں مکتوب اور انشاء کے معنی میں داخل ہے، اپنے اسلوب کے لحاظ سے انشاء میں بھی داخل ہو سکتا ہے۔ رقصات عامگیری اس کی بڑی اچھی مثال ہیں۔

مراسلات بھی مکتوبات ہی کی ایک نوع ہیں جو اصطلاحاً سرکاری حکام بالا دست کی طرف سے حکومت وقت کی ایما پر وقتی تقاضوں کے مطابق نظم و نسق سے متعلق امور پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ مراسلات اکثر رسمی مکتوب نگاری میں آتے ہیں اور اس لیے سرکاری بھی ہو سکتے ہیں، کاروباری بھی جب کہ نجی مکتوب نگاری میں عزیزوں اور دوستوں سے خطاب ہوتا ہے۔ عربی میں یہ تحریریں 'اخوانیات' کہلاتی ہیں۔ ترنسل بہر حال ان تمام مراسلات و مکتوبات کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔

عربوں کے تصور کے مطابق ایجاد و تحریر کی بنیادی غایت علم و معلومات سے بڑھ کر محض پیغام رسانی و معاملات ضروری کا ابلاغ تھی۔ یہ حقیقت اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ عربی میں تحریر یا رسم تحریر ہی کو خط کہتے ہیں اگرچہ بعد میں ابلاغ کی مختلف صورتوں کے لیے مختلف نام تجویز ہو گئے۔ البتہ اسلامی تہذیب نے اپنے دور میں مکاتیب و مراسلات کو اس درجہ اہمیت دی کہ قدیم زمانے میں ادب و انشاء کی تشکیل کی بنیاد ہی اچھی خطوط نویسی قرار پائی۔ چنانچہ جو شخص اس زبان و بیان سے کامل شناسائی رکھتا تھا جس کا تعلق دوسروں کے دل و دماغ سے ہے اور جو ان آداب و رسوم سے واقف ہوتا تھا جن کا تعلق روابط و تعلقات کی گونا گوں نوعیتوں سے ہے، اس کو اسلامی ادوار میں اکتسابات و فضائل

کے لحاظ سے شاید ترین آدمی سمجھا جاتا تھا اور اس لیے وہ سلطنت کے بڑے بڑے مہدوں کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ ابلاغ کے ذرائع پر قدرت کی اہمیت و فضیلت کا یہ اعتراف اسلامی عربی تہذیب کی روح شناسی کی اہم کلید ہے۔

ادب اسلامی میں مکتوبات تو حضور اکرمؐ کے زمانے ہی میں شروع ہو گئے تھے۔ آنحضرتؐ کے بعد خلفاء اور امراء کے خطوط کا سلسلہ جاری رہا اور پھر جب عبدالملک کے زمانے میں دیوانوں (دفاتر) کی زبان عربی ہو گئی اور ساری خط و کتابت عربی میں ہونے لگی تو دیوان کے شعبہ رسائل کا نام ہی دیوان الخفا پڑ گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ عربوں کے ہاں آخری اموی خلیفہ مروان ثانی کا کاتب عبدالحمید پہلا شخص تھا جو اس فن میں شہرہ آفاق ہوا۔ عربی میں سرکاری الخفا نگاری میں جن اشخاص کو شہرت حاصل ہوئی ان میں عبدالحمید کے علاوہ الحسن بن سہل، ابواسحاق الصالی، ابن العنبر، صاحب ابن عباد، القاضي، الفاضل العباد، الاصمغانی اور ضیاء الدین ابن ابیہر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

طرز تحریر کے لحاظ سے نثر کی اقسام:

مرزا قلیچ نے اپنی کتاب چار شریعت (ص ۵۹) میں نثر کی تین اقسام یعنی نثر عاری، نثر کج اور نثر مرتجہ گناکاران کی مثالیں بھی دی ہیں۔ پھر اس کے بعد و خاف، شرف الدین علی یزدی، خوبہ محمد گیلانی، ابوالفضل، ظہوری، ترشیزی، مرزا عبدالقادر بیدل، طاہر وحید اشرف، مرزا مہدی اور شفی صاحب عالم کی طرز تحریر کو پیش کر کے بالتفصیل ان کی خصوصیات بتائی ہیں۔ مرزا غالب بھی نثر کی تین اقسام ہی مانتے ہیں۔ چنانچہ چودھری عبدالغفور کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ”بندے کی تحقیقات یہی ہے کہ نثر تین قسم پر ہے۔ مطلقاً قافیہ ہے وزن نہیں ہے، مرتجہ وزن ہے قافیہ نہیں۔ عاری نہ وزن ہے نہ قافیہ ہے۔“

عالم کا دستور العمل مکتوب نگاری کب کہاں اور کن حالات میں تحریر ہوا؟  
 ۱۸۲۵ء میں جب انگریز معمول کے مطابق کسی فرمان بدعنوانی ریاست کے خلاف اقدام کر رہے تھے اور عالم اپنے سالے علی بخش خاں کے ساتھ اس جہم میں شریک احمد بخش خاں کے ہر کام میں تھے جنرل کامبر میر کے لشکر نے بھرت پور کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت ہمارے یہ دو بچے دیکھیں زلزلے میدان جنگ سے دور خدم و حشم کے لیے ایستادہ ٹیمپوں میں باور نوشی سے دل بہلا رہے تھے۔ جب فرصت سے طبیعت اوب جاتی تو علی بخش خاں مرزا سے درخواست کرتے کہ وہ قاری اشیا میں مہارت حاصل کرنے میں ان کی مدد کریں۔ مخاطب کا صحیح طریقہ القاب کا درست استعمال خطوط کی عبارت کو اشعار کے پرکھل حوالوں سے دلکش بنانے کے ٹکڑ اور خط و کتابت کے رموز ان کو سکھائیں۔ مرزا برضا اور قیمت یہ کام انجام دیتے۔۔۔۔۔“

اب علی بخش خاں اس دستور العمل کے وجود میں آنے کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں: ”بعد تقدیم نیایش دلاور جہاں آفریں۔۔۔ ہمیں برادر قدوسی اثر جناب اسد اللہ خاں حاکم نے یہ عالم کہ در نظم و نثر یگانہ و در سختوری مشہور زمانہ است از سر کھتر نوازی سرے بہ آموزشگاری من داشت۔۔۔ لاجرم مرا با انواع لطف و کرمیت نواختے و ہموارہ بدانش و نبیش رہنمائی کردے تا اینکه حسب الاحساس من در حقے چند از آداب و القاب و حکم رسید خطوط و شکوہ عدم ری مکاتبات رقم فرمود و بمن عطا نمود۔ آن اوراق را چون تعویذ پیادہ ہستم و آن لکشتہ حارہ و در فی تحریر دستور العمل خود ساختم۔“

عالم کے دستور العمل مکتوب نگاری کے اوامر و نواہی  
 یہ عالم نے ان اوامر کو اس طرح بیان کیا ہے۔

۱۔ ”مکتوب الیہ را بلفظی کہ فراخور حالت اوست در سر آواز صغیر آواز و ہم و زمرہ سنج مدعا کردم۔“



۲۔ ”(راقم) نوشتن دار تک گفتن دہد و مطلب را بجاں روشن بگذاؤں کہ در یافتن آن دشوار نہ بود و اگر مطلبے چند داشت باشد در تقدیم و تاخیر و صرف نگاہی بکار بود۔“

۳۔ ”در ہر نور و رعایت وجہ مکتوب الیہ در نظر دارو۔“

۴۔ ”بیشتر بہ مذاق اہل روزگار حرف زند۔“

۵۔ ”خوبی زبان نگاہ دارو۔“

۶۔ ”پیوستہ در آں کو شد کہ سادگی و لغزی شعار او بود۔“

۷۔ ”تا تواند سخن را درازی نہ دہد و از تکرار الفاظ محترز باشد۔“

غالب نے مندرجہ بالا ہر امر کے ساتھ اس کی فہمی کو معصحات میں شامل کیا ہے۔ ایک طریقے سے یہ اس ہی امر کی تشریح کے سوا کچھ نہیں۔ مثلاً اصول اوامر میں ہے کہ ایسے ایک لفظ سے کہ مکتوب الیہ کے حسب حال ہے خطاب کیا جائے اور مدعا نگاری شروع کر دی جائے۔ یعنی اس ضمن میں یہی ہے کہ القاب و آداب و خیریت کوئی و عافیت جوئی سے کہ حشو و زوائد میں آتے ہیں احتراز کیا جائے۔ دوسرے اوامر کے نواہی بھی اسی طرح قیاس کیے جاسکتے ہیں۔

غالب نے اپنے دستور العمل کی خود کس حد تک پیروی کی؟

یہاں تک پہنچنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ غالب نے خود اس دستور مکتوب نویسی کو اپنے مکاتیب میں کہاں تک ملحوظ خاطر رکھا اور واضح کردہ اصولوں کی خود کس حد تک پیروی کی۔ اب چوں کہ اس دستور العمل کی تکمیل اور عملی بخش جاں کو اس کی تحویل کے فوراً بعد ہی غالب نے سفر نکلتے اختیار کیا تو اس مقصد کے لیے وہی خطوط جو اس سفر کے دوران اور قیام نکلتے میں لکھے گئے انتہائی مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ اور یہ سارے خطوط بعنوان ”نامہائے فارسی غالب“ مرتبہ علی اکبر ترمذی و مطبوعہ غالب اکینہ دہلی کتاب کی شکل میں دستیاب بھی ہیں۔

مذکورہ بالا تالیف مکتوبات میں کل اکتیس خطوط ہیں۔ جس میں چوبیس خطوط باندے

کے مولوی محمد علی خاں کے نام ہیں جو غالب کے دوست، ہمدرد، کرم فرما سب ہی کہہ تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم دستور العمل کی دوسری شقوں کی طرف متوجہ ہوں سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے پہلے واشکاف اعلان کی "چوں نکل و ورق پہ کف کیرم" مکتوب الیہ راہ خط کے فراخورد دوست در سر آواز صلیح آواز و ہم و زمزمہ رخ مدعا گردم" کہاں تک بیرونی کی ہے۔ چنانچہ ان خطوط کے القابات کے جائزے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے چوبیس میں سے صرف پانچ میں اپنے دستور کی بیرونی کی ہے جب کہ چھ درہ میں صریح خلاف ورزی کی ہے کہ یہ خطوط "فرمانروائے کشور آگہی ملاذ مطاع رہی سلامت" جیسے القابات سے مزین ہیں۔ خطوط کے کرم خوردہ ہونے کے سبب تین خطوط کے القابات خطوط میں لکھے نہیں جاسکے۔ سو یہ تو بات ہوئی صرف القابات کی۔ اب دیکھتے ہیں کہ وہ زمزمہ رخ مدعا کس طرح ہوتے ہیں۔

مثنویوں کی شمولیت چوں کہ طوالت کا باعث ہے اس لیے ان سے صرف نظر کرتے ہوئے اس بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ ان خطوط میں اکثر و بیشتر غالب نے اپنے دستور العمل کی خلاف ورزی بڑے دھڑلے سے کی ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہ تحریریں تقریر سے کوئی قربت نہیں رکھتیں اکثر اس تحریر سے بھی بعید ہیں جن کا مقصد مدعا نگاری ہوتا ہے اور اگر ان دو خطوط کو بھی جو صنعت تعطیل میں لکھے گئے ہیں نظر میں رکھا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ غالب نے خود وہی کیا ہے جس سے وہ بظاہر نفرت کا اعلان کرتے تھے کہ یہ دونوں خطوط صریحاً بانضس سوائے خود نمائی کے اور کسی دمرے میں نہیں آتے۔ بلکہ ان خطوط کی نقل کو (یہ دو خطوط مولوی محمد فضل حق صاحب اور لکھنؤ کے وزیر معتمد الدولہ کے نام تھے) محمد علی خاں کے خط میں ارسال کرنا تو خود نمائی کا بھی تیسرا درجہ نظر آتا ہے۔

اب اگر نثر فارسی کے باب میں غالب کی انتہائی اہم تالیف "بیج آہنگ" دیکھی جائے تو وہاں بھی صورت حال کچھ مختلف نظر نہیں آتی۔ "بیج آہنگ" کے آہنگ پنجم میں ۱۶۹ خطوط ہیں جو اے مکتوب الہم کو لکھے گئے ہیں۔ یہ خطوط ایک عام انداز سے کے مطابق ۳۵ سال کے عرصے کو محیط ہیں۔ مکتوب الہم میں ان کے شاگرد دوست، بے تکلف

یارانِ بزمِ امرا دور افتادہ عقیدت مند و پندار صاحبانِ قلم اہلبا' حکام وقت سب شامل ہیں۔ لیکن ان ۱۶۹ خطوط میں بھی کسی جگہ غالب نے بھول کر بھی اپنے بتائے ہوئے دستورِ اہمل کی پیروی نہیں کی ہے۔

یہاں لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے! ابھی ان کے دستورِ اہمل کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے اس کی خلاف ورزی شروع کر دی (یہ خاص حوالہ سفر و قیام نکلتے کے دوران لکھے گئے خطوط کا ہے)۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ غالب نے اپنے دستورِ اہمل میں اس مکتوب نگاری کے اصول بتائے ہیں جو مدعا نگاری پر مبنی ہو۔ یہ دستورِ اہمل ان مکاتیب کے لیے نہیں جو اختصار نگاری کے ذریعے میں آتے ہوں اور جن کا مقصد تعین طبع، تخلیق ادب اور سب سے بڑھ کر ”نہایا ندن قدرت نویندگی“ ہو۔ اس طویل تحریر کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب کے دستورِ اہمل مکتوب نگاری کا ان کے اکثر فارسی خطوط پر اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ اور اس موضوع پر ڈاکٹر شیخ محمد اکرام راقم مقالہ سے متعلق نظر آتے ہیں۔

ح" غالب نے مرزا علی بخش کی استدعا پر جو فارسی رسالہ ۱۸۴۵ء میں مکتوب نویسی کے متعلق لکھا تھا اس سے خیال ہوتا ہے کہ خط و کتابت کے متعلق ان کا شروع سے ایک خاص نقطہ نظر تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مکتوب نویسی میں وہی زبان استعمال ہو جو گفت و شنید میں ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے فارسی خطوط میں اس نقطہ نظر کی پیروی نہیں کی اور مکتوب نویسی میں وہی بے تکلف اور مصنوعی طرز اختیار کیا جو ان کے زمانے میں مروج تھا اور جس پر ان سے پہلے مشہور اختصار پرداز کا فرماتھا۔ چنانچہ وہ قیقل کی سلیس فارسی نثر پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور لکھتے ہیں ”تقریر اور ہے تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بعدِ تحریر میں آیا کرے تو خوبہ بقراط اور شرف الدین یزدی اور ملا حسین کاشانی اور طاہر وحید یہ سب نثر میں کیوں، خونِ جگر کھایا کرتے اور وہ سب طرح کی نثریں جو حالہ دیوانِ شکستہ قیقل متوفی نے شکلیہ اہل ایران لکھی ہوں، نہ رقم فرمایا کرتے۔“

”مرزا نے نثر نویسی کے متعلق قیقل کا نقطہ نظر جو اصولاً صحیح تھا قبول نہ کیا لیکن جب

وہ ۱۸۵۰ء میں تاریخ نویسی پر مامور ہوئے اور ان کے پاس اس قدر وقت نہ رہا جو فارسی مکاتیب... کے لیے کافی ہو اور ساتھ ہی بڑے حسابے کے سبب جب وہ اس کاوش اور دماغ سوزی کے لائق نہ رہے تب انھوں نے اردو میں مراسلت شروع کی اور زبان میں بے تکلف طرز تحریر استعمال کیا...

مرزا نے اردو میں سادہ اور بے تکلف طرز تحریر کسی ادبی اصول کے تحت نہیں بلکہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے شروع کیا تھا... لیکن جب یہ طرز تحریر کامیاب ہو گیا اور ان کی طبع خدا داد نے اس میں ایسی رنگینیاں پیدا کر دیں کہ خاص و عام کو پسند آیا تو وہ اس پر فخر کرنے لگے اور اسے خاص اپنی ایجاد قرار دیا۔

۱۔ مولانا غلام رسول تھہر بھی اس موضوع پر مضمون نگار سے متعلق ہیں اور خطوط غالب کے دیباچے میں فرماتے ہیں: ”مرزا غالب نے اپنے (اردو) خطوط میں سادہ اور سلیس انداز اختیار کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس زمانے میں اردو مکاتیب شروع کی جب فارسی میں ان کی معافی اوج کمال کو پہنچ چکی تھی... یہ حقیقت ان پر کھل چکی تھی کہ عمارت میں قدم قدم پر بیچ ڈالنا، فنی ترکیبوں سے بوجھل بنانا، علم و فضل کی قرائش کا صحیح طریقہ نہیں۔ بلکہ فلس مطلب ایسے رنگ میں پیش کرنا چاہیے کہ مخاطب بے تکلف اسے سمجھ جائے۔“

اس مرحلے پر ایک انتہائی دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے جو ہر دیدہ ور اور صاحب علم کی توجہ چاہتا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا وجہ ہے کہ مکاتیب نگاری کے محاسن جانتے ہوئے اور اس دستور العمل کا پرچار کرتے ہوئے جس پر ان کے اردو مکاتیب نگاری کی ساری عمارت سرکشیدہ کھڑی ہے، وہ فارسی خطوط میں ان اصولوں کی پیروی نہ کر سکے بلکہ کہتا چاہیے کہ واضح اور اعلانیہ خلاف درزی کرتے رہے۔

اس اہم سوال کا جواب، لیکن وہ بھی صرف ایک حد تک جناب مالک رام نے ”ذکر غالب“ میں دیا ہے۔ چنانچہ غالب کے نئے اسلوب نگارش مکاتیب کے بارے میں جو اردو سے وابستہ ہے اور اردو ادبیات میں وجہ امتیاز و افتخار ہے بڑی وضاحت سے

کہتے ہیں۔ "اس ضروری اصلاح کو فارسی میں رائج کرنا بہت مشکل تھا کیوں کہ ان کے مخاطب بیشتر پرانی طرز کے بزرگ اور روایت کے فقیر روایت پرست حضرات تھے۔ یہ لوگ صدیوں سے ایک خاص پر تکلف طرز مکاتیب کی تقلید کرتے آ رہے تھے۔ انہیں کسی اصلاح کے قبول کرنے یا خود اس پر عمل کر لینے پر آمادہ کر لینا محال تھا۔۔۔ اس کے مقابلے میں چوں کہ انھوں نے اردو نویسی بہت بعد میں شروع کی اور یہاں ان کے مخاطب عام طور پر نوجوان طبقے کے لوگ یا عزیز شاگرد تھے اس لیے نہ صرف یہ کہ وہ اس تبدیلی پر جہز نہ ہوئے بلکہ کسی حد تک خود ان کے معاون بن گئے اور فرمائش کر کے ان سے یہ خطوط لکھواتے رہے۔" میرے خیال میں اوّل تو یہ بات کہ ان کے اردو اسلوب نگارش کے پرستار صرف یا اکثر نوجوان طبقے کے لوگ تھے گل نظر ہے گویا ان کے فارسی اسلوب کے شائقین اکثر بوز سے عمر رسیدہ بزرگوں میں سے تھے! ممکن ہے یہ دعویٰ چنداں درست نہ ہو لیکن اس قدر حقیقت ضرور ہے کہ یہ مندرجہ بالا اقتباس سوال کا پورا جواب نہیں۔ البتہ ادھورا جواب ضرور ہو سکتا ہے۔ اس معنی میں کہ اظہار بیان کے، یہ پر تکلف، آرائشی اور مصنوعی سانچے اس قدر مضبوط، منضبط اور مسلم تھے کہ ان سے اس دور کے کسی صاحب علم کی روگردانی ممکن نہ تھی۔ لیکن غالب کے لیے اردو کے اس اسلوب کو فارسی میں رائج کرنا ایک اور سبب سے بھی ممکن نہ تھا اور قارئینِ محترم وہ سبب یہ تھا کہ فارسی ان کی مادری نہیں اکتسابی زبان تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اردو کے معیار کے خطوط فارسی میں اپنی تمام قدرت بیان کے باوجود لکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ بے شک مبداء فیاض نے فارسی آموزی میں بھی غالب کے لیے پوری فیاضی سے کام لیا تھا اور ان پر اپنے سارے خزانے کھول دیے تھے لیکن اکتسابی مہارت جو ہڈیوں یا مقلوبوں سے حاصل ہو شیر مادر کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس فرق کو وہ بڑے واضح طور پر اپنے خطوط میں بار بار مختلف الفاظ میں بیان کرتے رہے ہیں۔ مثلاً عبدالرزاق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "بندہ نواز فارسی میں خطوط لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ بیراتہ سری وضعف کے صدموں سے محنت چڑھوی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت کو زوال ہے۔"

یا سولانا محمد عباس بھوپال کو لکھتے ہیں "از دیر باز عشقِ نثر بہ پارسی زبان آئینِ من  
نہست۔ نامہ ساجدست بہ اردو جلتی شود۔ یارب ایس فرمان چوں بجای آرم دور  
نامہ چہ نو-نہم۔"

مندوبہ بالا محتاجی سے ثابت ہوتا ہے کہ مکاتیب نگاری کے صحیح اصولوں سے واقف  
ہونے اور ان اصولوں کی حیثیت پر یقین رکھنے اور ان کے پرچار کرنے کے باوجود وہ  
اصول ان کے خون میں رہے جیسے نہیں تھے۔ اور وہ اس وجہ سے کہ فارسی ان کی اکتسابی  
زبان تھی۔ اس کی ہر تحریر "سخت چڑھی اور جگر کاوی کی قوت" کی طلب کا رخصی۔ اردو  
خطوط کی طرح ان کو قلم برداشتہ نہیں لکھا جاسکتا تھا اور نہ ہی وہ خطوط اردو خطوط کے اس  
لئے اس آہنگ اس جاذبیت کے مرتبے کو پہنچ سکتے تھے۔

### دستور العمل مکتوب نگاری کے داخلی و خارجی متابع

اس ضمن میں بنیادی حیثیت تو ان کی فطری جذبہ پسندی اور انفرادیت کو حاصل  
ہے۔ یہ اس دستور العمل کا داخلی منبع تھا۔ یہ وہ فطری رجحان تھا جو وہ لے کر پیدا ہوئے اور  
جو انہیں زندگی کے ہر شعبے میں تقلید سے روکتا اور منفرد روش اختیار کرنے پر مجبور کرتا۔ وہ  
اس وقت پایا رخ اوڑھتے جب کوئی نہیں اوڑھتا تھا۔ وہ لنگی جو وہ سر پر باندھتے تھے عام  
دنی والوں سے یکسر مختلف ہوتی تھی۔ انہوں نے اپنے چہرے کی حرکت میں بھی ہمیشہ امتیاز  
رکھا۔ جب داڑھی رکھی تو سرمندہ اوایا۔ لیکن اس بالٹنی رجحان کو ہمیز کرنے کے لیے انہیں  
خارج میں بھی ایسے عوامل ملے جس سے ان کی جدت پسندی راسخ ہوتی گئی اور پلا خر  
مکتوب نگاری میں بھی عام روش سے ہٹ کر وہ اس دستور العمل تک پہنچے جس کو انہوں  
نے آہنگ اول میں علی بخش خاں کے لیے منتخب کیا۔

عالم کے اس بالٹنی رجحان کو شدید ہمیز اس ماحول سے ملا، جو انگریزوں کے  
حکامِ تعلیم کے سبب ہندوستان میں پیدا ہو گیا تھا۔ ان ہندوستان میں انگریزوں نے ابتدا  
ی سے تعلیمی اداروں کے قیام پر خاص توجہ دی تھی جس کی وجہ تحریک ان کی یہ خواہش تھی

کہ نوآبادیاتی استحکام کے لیے انگریز افسروں کے لیے دیسی زبانوں اور تہذیب سے واقفیت کا موقع فراہم کیا جائے اور اس طرح ان کے رواداروں کو تہذیبی نقطہ نظر سے حکومت بنانے میں مدد ملے گی۔ چنانچہ دارن ہسٹنگز نے ۱۷۸۱ء کلکتے میں مشہور مدرسہ عالیہ قائم کیا سر ڈکن نے ۱۷۹۱ء میں بنارس میں ہندو سنسکرت کالج کی بنیاد رکھی اور ۱۸۰۰ء میں کلکتے میں لارڈ ولزلی نے فورٹ ولیم کالج کی تاسیس کی۔ ۱۸۰۳ء تک فورٹ ولیم کالج کے جان گلکراسٹ انگریزی کی منتخب کہانیوں کا ہندوستانی، فارسی، عربی، برج بھاشا، بنگالی اور سنسکرت میں ترجمہ کرا چکے تھے۔ آگرہ کالج ۱۸۲۳ء میں قائم کیا گیا اور بعد میں بمبئی، بنگال اور مدراس تینوں پریزیڈنسی صوبوں میں یونیورسٹیوں کی ابتدا ہوئی۔ اور دہلی میں مدرسہ غازی الدین میں ۱۷۹۲ء سے بروئے کار اسکول کی تنظیم جدید برطانوی مجلس تعلیم عامہ کی طرف سے فراہم کردہ مالی وسائل سے عمل میں آئی۔“

”۱۸۲۳ء سے ۱۸۵۷ء تک دہلی کالج سی ایف ایڈریوز کے الفاظ میں دانش جدید کو رواج دینے کا مرکز بن گیا جو تاگزیر طور پر واضح ترین مرکز تہذیبی لسانی تھا۔ انگریزی زبان و ادب کی جماعتیں ۱۸۲۷ء میں شروع کی گئیں۔ کالج میں اردو، عربی اور فارسی ادب کے لیے ایک علاحدہ اور غفل یعنی مشرقی شعبہ بھی تھا۔ جو انتہائی مقبول ہو گیا۔ جدید انگریزی علوم کی تحصیل کے لیے طلبہ ان جماعتوں کو جہاں ذریعہ تعلیم اردو تھا، چھوڑتے نہیں تھے۔ فارسی اور عربی میں طلبہ کی جس معیار تک رسائی تھی وہ بہت بلند تھا۔ ممتاز مشاہیر الطاف حسین حالی اردو کے مسلم الثبوت نثر نگار نذیر احمد عربی کے ممتاز فاضل مولوی ضیاء الدین اور آب حیات کے مصنف محمد حسین آزاد کا تعلق اسی مشرقی شعبے سے تھا۔“

”... زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اردو کی بے مثل مقبولیت پر منتج ہونے والی ادبی سرگرمیوں کی حقیقی نشاۃ ثانیہ کا آغاز دہلی کالج کے قیام سے پہلے ہو چکا تھا۔ کالج نے لوگوں کی قوت مخیلہ کو گرفت میں لیا تو ان درجوں کی بدولت جو اس نے مغرب میں علوم طبعیات کی تحصیل میں پیش رفت کے لیے باز کیے تھے، علوم طبعیات پر انگریزی کتابوں

کا بڑی جھانکھی اور جوش و خروش سے اردو میں ترجمہ کیا جاتا اور تعلیمی تقسیم کی جاتیں۔ کالج کے ایک اور ممتاز فارغ التحصیل سرسید احمد خاں تھے جنہیں ریاضی اور علم آثار قدیمہ میں یکساں درک تھا۔ اور جنہوں نے بعد میں ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ میں مسلم ایجوکیشنل کالج قائم کیا۔“

اب میں آپ کی خدمت میں فاضل مرتب مرقعی حسین فاضل کے کلمے ہوئے ’عمود ہندی‘ کے دیباچے سے کچھ اقتباس پیش کرتا ہوں جو ذریعہ نظر بحث میں انتہائی مناسب اور برکت نظر آتا ہے۔

۱۲ ”ایسٹ انڈیا کمپنی نے تعلیمی نصاب مرتب کیے تو فارسی خطوط و رقعات کے ساتھ اردو خطوط کے نمونے بھی درسی کتابوں میں داخل کیے گئے۔ چنانچہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اس قسم کی ایک کتاب موجود ہے جس کا نام ”فارسی اور اردو کی انشا“ ہے۔ اس کتاب پر فورٹ ولیم کالج کی مہر لگی ہوئی ہے۔ مرتب نے جس کا نام Capt. T.H.G. Besant ہے فنی فہت خاں اکبر آبادی کی مدد سے مرتب کر کے یہ کتاب اس وقت کے گورنر کو پیش کی تھی۔ اس میں مختلف قسم کے رقعات و عرائض کے نمونے دیے گئے ہیں، اس طرح کہ ہر فارسی خط کے سامنے اس کا اردو ترجمہ موجود ہے۔ یہ کتاب ضخیم میں ہے اور ۱۹۱ صفحات پر مشتمل ہے۔“

خطوط کے چننے چن جانے کے دو مقصد تھے۔ ایک تو یہ کہ طالب علم فارغ التحصیل ہونے کے بعد سرکاری اور سیاسی مراسلت کے اسالیب سے پوری طرح واقف ہو جائے دوسرے یہ کہ اسالیب بیان کے ساتھ ادب کے اعلیٰ مسائل معنی و بیان کی تعلیم پاکر ان کے استعمال کا طریقہ سیکھ لے... ہزار سالہ مشکل پندہ کا دور ختم ہونا ہی تھا... چنانچہ سلاست کا دور آنا ایک طبعی عمل ہے۔ اتفاق سے اس کے کئی عوامل بھی پیدا ہو گئے انہی عناصر کے لیے عربی، فارسی اور اردو کا بیک وقت سمجھنا مشکل تھا۔ فن خط نویسی کے لیے اسلامی روایات و علوم، عربی ادب اور فارسی کے رموز و نکات سے واقف ہونا ضروری تھا جو انگریزوں کے لیے ناممکن بات تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک نئی تہذیب کو بھی



جہنم دینا چاہتے تھے... چنانچہ انھوں نے اپنا نیا نصاب تیار کرنے والوں کو الف لیلہ، مقامات حریری، تاریخ و صاف... کے اسالیب کے برعکس سادہ زبان لکھنے کا پابند کیا...

... انھار پر داری یعنی خطوط نگاری کے لیے بھی سادہ تحریریں مطلوب تھیں۔ چنانچہ اس طرح کی جو کتابیں لکھوائی گئیں ان میں سے دو ایک میری نظر سے گزر چکی ہیں۔ یہ کتابیں ۱۸۵۷ء سے پہلے لکھی گئی تھیں اور مخصوص تعلیمی حلقے کے نصاب میں شامل تھیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد چوں کہ انگریزوں نے عمل داری دور دور تک پھیل گئی اس لیے مطبوعات اور مکتبوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں میں نے جو کتاب ابتدائی جماعتوں میں پڑھی تھی اس کا نام ”مکتوب احمدی“ تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ کتاب ۱۸۶۰ء کے قریب مرتب کی گئی ہوگی۔ اس وقت میرے سامنے ایک ایسی نصابی کتاب ”انھار اردو“ ہے جو خطوط، واقعات و سیدات پر مشتمل ہے اور جس کا خط ”مکتوب احمدی“ کی طرح شکستہ ہے۔ یہ کتاب ۱۸۶۳ء میں ترتیب دی گئی تھی... بخلاف یہ مقصود ہے کہ غالب کے عہد میں فنی اور نصابی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے یہ کتابیں رائج ہو چکی تھیں۔“

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظام تعلیم نے سارے ہندوستان میں نئے نظریات و خیالات کے ذریعے ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس میں دلی کو مغلیہ سلطنت کا پایہ تخت ہونے کے سبب اور دلی کا لچ کی زبردست کامیابی کے طفیل ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ غالب فطرتاً جہد پسند اور متفرد مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی بیدار مغز اور ذکی الحس انسان تھے۔ اس لیے انھوں نے ان تمام تبدیلیوں کو اپنے دوسرے معاصرین کے مقابلے میں بہت جلد محسوس کر لیا اور فکری طور پر مکتوب نویسی میں سادہ اور سلیس زبان کے ساتھ مذہب نگاری کے اصول کو تسلیم کر لیا اور زندہ و پابندہ رہنے کے عام قانون کو اپنی شاعری کی طرح اپنی نثر پر بھی نافذ کر لیا۔ لیکن یہاں جو خاص بات لائق توجہ ہے وہ یہ کہ ۱۸۲۵ء میں علی بخش خاں کے لیے آہنگ اول میں دستور العمل نامہ نگاری لکھ کر وہ اس طرز و اسلوب کے بانی نہیں بن گئے۔ البتہ ان کو اس نئے اسلوب کو مستحضر اور مروج کرنے کی سیادت حاصل ہے۔ اور یہ اس لیے کہ کمپنی کے اپنے

امردونی انتظامی مقاصد کے پیش نظر خصوصاً اور جدید نظام تعلیم کے مقاصد کی تکمیل کے لیے عموماً مکتوب نگاری کا وہ آئین جو غالب نے آہنگِ اول میں تحریر کیا ہے بہت عرصہ پہلے عمل میں آچکا تھا اور سچ "مدرسوں اور کالجوں میں اس کے اصول بتائے اور پڑھائے جا رہے تھے۔ اور منطقی و صحیح نثر کے خلاف سادہ و سلیس نگاری فوراً و یوم کی کتابوں کے علاوہ بھی نظر آ رہی تھی۔ مثلاً بائبل کا وہ ترجمہ جو بہرام پور میں چھپا، شاہ عبدالقادر محدث اور شاہ رفیع الدین محدث کے تراجم قرآن مجید اور شاہ اسماعیل شہید کی "تقویتِ الایمان" جو ۱۸۱۸ اور ۱۸۲۰ کے درمیان لکھی گئی۔ پھر سید احمد شہید بریلوی کے مریدوں اور معتقدوں نے عربی کی بعض مذہبی کتابوں کے سلیس اردو میں ترجمہ کیے اور اس طرح شیعوں چھوٹے چھوٹے رسالے عام فہم زبان میں لکھے گئے جن کا مقصد... یہ تھا کہ اردو پڑھنے والا ہر شخص استاد کی مدد کے بغیر ضروری دینی مسائل سے آگاہ ہو جائے۔ اس طرح سادہ اور عام فہم اسلوب کو خاص تقویت پہنچی۔"

مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ مکتوبات کے ذمے میں حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات بھی سلیس و سادہ نگاری اور اس لیے ابلاغ و مدعا نگاری کی بہترین مثال ہیں۔ بلکہ اس مرحلے پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اپنے وسیع و عالمگیر مقاصد کے پیش نظر بزرگانِ دین کے جتنے مکاتیب بھی ہیں وہ مدعا نگاری اور سادہ نویسی کی منہ بولتی تصویر ہیں اور عرصہ دراز سے اپنی قدیم روایت کا حصہ ہیں۔

### غالب کی فارسی نثر کے اجزائے ترکیبی

میرے خیال میں غالب کی نثر کے اہم اجزائے ترکیبی مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ خود نمائی اور قدرتِ بیان کا مظهر و مظهراتی۔

۲۔ سرہ نویسی کی کوشش۔

۳۔ دستوری حلازمات و جمع نگاری و محاورات۔

ان کی فارسی مکاتیب نگاری بڑی حد تک انھیں نگاری کے ذمے میں آتی ہے جو

بذات خود صنایع اور بدائع پر منحصر ہے۔ یہ اظہار و بیان کے ایسے عجیبہ اور مشکل طریقے ہیں کہ ان کو کسی تحقیق کے محاسن میں شمار کرنا ہی آج خلاف عقل اور بے معنی نظر آتا ہے۔ لیکن اُس زمانے کی روش اور رواج نے کسی اعلیٰ قومی و سماجی نصب العین نہ ہونے کے سبب اُن کو تحقیق کے محاسن میں شامل کر رکھا تھا۔ غالب بھی اپنے فارسی خطوط میں ان پر تصنع عجیبہ اور گراں فہم اسالیب کے اتباع میں ”اس راوخن کے غول“ میں شامل نظر آتے ہیں جس کو وہ بڑی فطرت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ نامہائے فارسی غالب مرتبہ اکبر علی ترنزی میں شامل چھ سات صفحات پر مشتمل صرف وہ دو خطوط جو صنعت قطعی و صنعت مطلق الحروف میں لکھے گئے ہیں اگر نظر میں رکھے جائیں تو غالب کی ترقی پسندی اور بلند خیالی کا پل کھل جاتا ہے اور اگر صرف عہد شاہجہاں میں مکتوبات سعد اللہ خاں، صفحات برہمن (چندر بھان برہمن)، انشائے منیر (منیر لاہوری) اور انشائے ہر کرن (ہر کرن) کو شامل کر کے ہم اٹھارویں اور انیسویں صدی تک آئیں تو فن انشاء کی تحقیقات جہازوں کی تعداد تک پہنچتی ہیں۔ سید (صاحب تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، نے صرف اٹھارویں اور انیسویں صدی کی اہم ترین تالیفات کی تعداد چالیس کے قریب بتائی ہے) اور ان کے سامنے غالب کے پر تصنع خطوط علمی و ادبی دنیا کا کوئی اہم واقعہ معلوم نہیں ہوتے۔ چنانچہ اس بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غالب کی فارسی خطوط نگاری ان کے اپنے یا ساہتہ دور کے کسی انشاء نگار کی خود نمائی کی کاوش سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسے اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ غالب اپنے فارسی خطوط میں زور بیان کے اظہار اور قدرت کلام کے مظننے میں عام انشاء نگار کی طرح خود نمائی کے شکار نظر آتے ہیں۔

سرہ نویسی

غالب کے فارسی خطوط کی نثر کا دوسرا اہم جزو ترکیبی سرہ نویسی ہے یعنی ایسے الفاظ کا استعمال جو خالص فارسی کے ہوں اور ان میں عربی الفاظ کی ملاوٹ نہ ہو۔

ڈاکٹر محمد غلام سرور اپنی تصنیف تاریخ زبان فارسی کے پانچویں باب "۵۱" مہفست سرہ نویسی در شہ قارہ پاکستان و ہند" میں فرماتے ہیں "مادر تخیل تحقیقات خود نامہ ای از امیر خسرو دہلوی بدست آورده ایم کہ او در دو مین رسالہ از رسائل الامچاز خود درج نموده است۔ اس نامہ در ۱۲۸۳ء در فارسی خالص نوشتہ شدہ است و اس امر را پائیات رسالہ کہ امیر خسرو دہلوی در بلخ چہارم قرن سیزدہم میلادی بخاری خالص دل بستگی داشتہ و اثر خوبی از خود بیادگار گذاشتہ است۔"

امیر خسرو کے بعد فارسی خالص کا بڑا حامی و بانی شیخ ابوالفضل علوی کو مانا جاتا ہے اور ڈاکٹر غلام سرور کے مطابق اکثر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ ابوالفضل کے بعد غالب ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے خالص فارسی نویسی پر سنجیدگی سے توجہ دی۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ دراصل اس ضمن میں ہمارے سارے زبان فارسی کے تاریخ دان اس دینی ادب کو جو بارہویں، چیرھویں صدی عیسوی سے اب تک لکھا جا رہا ہے حساب میں نہیں لاتے۔ یہ ادب ملفوظات و مکتوبات کی شکل ہی میں دستیاب نہیں بلکہ باقاعدہ عام رسالوں اور کتابوں کی شکل میں دینی موضوعات پر تخلیق ہوتا رہا ہے اور چون کہ اس کا مقصد ہی سلیس زبان میں ابلاغ مفہوم تھا اس لیے اس ادب کی زبان سادہ عام فہم اور نتیجتاً عربی کے بھاری بھرکم الفاظ سے پاک تھی۔ گویا سرہ نویسی کو ان علما یا ساکنان طریقت و شریعت نے کسی تحریک کے طور پر جانا نہ اپنایا۔ البتہ مدعا نگاری، کے سبب وہ سلیس و سادہ زبان استعمال کرنے پر مجبور تھے۔ اس ضمن میں شیخ علی سرہندی کے مکتوبات۔ کہ علاوہ ان کے بیٹے شیخ محمد مصوم کے مکتوبات بھی پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اب اپنے دعوے کے ثبوت میں ڈاکٹر غلام سرور ہی کی مرتبہ کتاب "جواہر الاولیا" کے مقدمے سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں یہ کتاب مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان سے ۱۹۷۶ء میلادی میں شائع ہوئی ہے۔ "... وادہای بسیار قہج است کہ در حدود یک قرن و نیم بعد از ابوالفضل علوی، سید باقر بن عثمان بخاری در یک قریہ دور دست (انج شریف) ... در جواہر دوم اس کتاب "جواہر الاولیا" در بیان نام ہائے باری تعالیٰ لغات و ترکیبات و جملات فارسی سرہ را

”ہندی زیادہ استعمال کردہ است۔۔۔۔۔“

یہ لہجے دعویٰ کرنے والے ہی نے خود اپنے بیان کی تردید کر دی۔ حقیقت میں ہم اپنی لاعلمی کے باعث یہ تصور کرتے ہیں کہ ابوالفضل علامی کے بعد غالب ہی فارسی سرہ نویسی میں سربراہِ درودہ شخصیت ہے جب کہ عرفانی ادب میں تو زبان فارسی میں جو کچھ بھی چمپا ہے اس میں سے اکثر فارسی سرہ ہی ہے۔ غالب سے پہلے بھی سیکڑوں اور اس کے بعد بھی سیکڑوں ایسے اٹھ اٹھارہوں کے جنہوں نے فارسی سرہ میں لکھ کر اسی قدرتِ زبان کی نمائش کی ہوگی۔

اتفاق سے میرے سامنے اس وقت ایک انشائیہ کتاب ہے، جس کا نام ہے ”انشائی بہارِ بزم“ ہے۔ یہ بیس صفحات پر مشتمل ہے، ۱۲۹۸ھ میں مطبع انوارِ محمدی میں محمد تنج بہادر کے نام سے چمپی ہے، ۱۳۱۰ رقتات پر مشتمل ہے اور ایک طبر معروف شخص سید امانت علی ساکن روٹاہی معروف پہ نورانی از مضامین فیض آباد کی تصنیف ہے اور فارسی سرہ میں لکھو سے کانپور تک کے کشتی کے سفر میں قلم برداشت لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے چند دوسرے دلدوز حقائق یہ ہیں کہ انشائی بہارِ بزم کا مسودہ ۱۲۰۷ھ جب ۱۲۲۶ھ کو مکمل ہو چکا تھا جب غالب صرف چودہ برس کے تھے (غالب کی پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۲ھ)۔ دوسری دلدوز حقیقت اس کتاب سے یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اس کتاب کی تحریر اور طباعت میں پورے بہتر (۷۲) سال کا فصل ہے۔ (تحریر ۱۲۲۶ھ طباعت ۱۲۹۸ھ)۔ عیسوی سال کے حساب سے دہخندو (جو غالب کے دعوے کے مطابق فارسی سرہ میں لکھی گئی ہے) یکم اگست ۱۸۵۸ء کو مکمل ہوئی اور نومبر ۱۸۵۸ء کو طبع پذیر ہوئی جب کہ ”انشائی بہارِ بزم“ ۱۸۱۱ء میں مکمل ہوئی اور ۱۸۸۰ء میں طبع ہوئی۔ سو قاری معظم میں نہیں سمجھتا کہ غالب نے اپنے فارسی خطوط اور دوسری نثر میں سرہ نویسی کر کے کوئی ایسا معرکہ مارا ہو جو اس دور کے علمی و ادبی ماحول میں مجھ کی رکتا ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ غالب نے سرہ نویسی کی کوشش میں فارسی ادب میں نئے الفاظ نئی ترکیب اور نئے استعاروں کا خاصہ اضافہ کر دیا ہے۔ اور بقول ڈاکٹر نذیر احمد صاحب علیہ السلام ”ان کی ہدایت فارسی زبان کا دامن مالا مال ہو گیا ہے۔“

آئیے اب ان اجزائے ترکیبی کے آخری نکتے پہنچ لیں، دستورِ ملازمت و محاورات پر۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد احمد اپنے مقالے ”غالب کی فارسی نثر نگاری“ میں مندرجہ ذیل نکات تحریر فرماتے ہیں۔

۱- ان کی عبارت کی کوئی ایسی سطح نہیں جس میں پہنچ نہ ہو۔ یہ ان کے خطوط کی بڑی خصوصیت ہے اور مسئلہ طور پر عبارت کی دل کشی میں اضافہ کرتی ہے۔

۲- ان کی فارسی نثر کی دوسری خاصیت یہ ہے کہ انھوں نے برخلاف متداول و مروجہ اشکالِ افعال کے قدیم اشکالِ افعال استعمال کیے۔

۳- وہ ماضی تہائی کا استعمال فعلِ استمراری کی بجائے جو آج کل مروج ہے قدیم طریقے سے کرتے ہیں۔

۴- صنعتِ مقلوب کا استعمال۔

۵- تک اضافت کر کے مضاف الیہ مقدم کرتے ہیں اور ”کا“ اضافہ کر دیتے ہیں۔

۶- فارسی ادبوں کی بیرونی میں صفتِ مرفوع کے دونوں اجزاء کے درمیان فقرات شامل کر لیتے ہیں۔

۷- دساتیر کی بیرونی میں صفاتِ مرکبہ کو کافی استعمال کیا ہے۔

۸- عربی زبان میں صفتِ موصوف کی تطبیق ضروری امر ہے۔ فارسی میں ایسا کوئی قاعدہ نہیں۔ لیکن غالب جو فارسی نفوذ کے اس قدر حامی تھے عربی اصول کی پابندی کرتے نظر آتے ہیں۔

۹- محاورات کے استعمال میں بڑی چابکدستی سے کام لیا ہے۔

اب اگر اپنے عہد کے ایک دوسرے مکتدرس صاحبِ علم و فضل جناب ڈاکٹر عبدالب شادانی پر نظر ڈالی جائے تو وہ ”مرزا غالب کا اسلوب نگارش“ میں مندرجہ ذیل نکات لایقِ توجہ سمجھتے ہیں:

۱- مرفوعہ عربی الفاظ کے بجائے فارسی الفاظ کا استعمال۔

۲- فارسی کے مانوس و مروجہ الفاظ کے بجائے نامانوس و غیر معروف الفاظ کا استعمال۔

- ۳- اضافتِ مقلوب کا استعمال۔
- ۴- قراد و فرد کا بکثرت استعمال۔
- ۵- مکرر ایہیوں کے مشتقات کا بکثرت استعمال۔
- ۶- لفظ 'والا' کا بکثرت استعمال۔
- ۷- مکرر ایہیوں کے مشتقات کا بکثرت استعمال۔
- ۸- مکرر اردوں کے مشتقات کا بکثرت استعمال۔
- ۹- شہیدوں کے مقابلے میں شہنودوں اور شہیدوں کے مقابلے میں شہنودوں اور شہنوں کے مقابلے میں شہنوں کا استعمال۔
- ۱۰- کہیں کہیں قافیے کا استعمال۔
- ۱۱- کہیں کہیں صنعتِ عکس کا استعمال۔

مندرجہ بالا نکات کو غالب کی نثر کا سامانِ تعمیر گردانتے ہوئے اور اکثر عندِ لب نے شیخ آہنگ اور آئین اکبری کی نثر کا موازنہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ابوالفضل کی طرح غالب کی بھی الفاظ کی اپنی فرہنگ ہے جو اکثر آئین اکبری سے ماخوذ ہے۔ بلکہ آخر میں تو وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ”اس ساری بحث کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ فارسی مکتوب نگاری میں غالب کا سارا کا سارا اسلوب ایک بڑی حد تک ابوالفضل اور قزوینی حد تک بیدل کی نقل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس سامان سے انھوں نے اپنا مکان سہایا ہے اصل میں یہ سارا سامان ہی دوسرے گھر کا ہے۔“

اس ضمن میں پہلی اور سب سے وقیع بات یہ ہے کہ جس طرح انسانی رشتوں میں بزرگوں کی محبت کا دریا اپنی اولادوں کی جانب بہتا ہے بالکل اسی طرح ادب کا دریا بھی اوپر سے نیچے کی جانب بہتا ہے۔ ادب میں بھی ہر نسل اپنے پیش روؤں سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ اگر ولی دکن نہ ہوتے تو شاہ حاتم کا وجود ممکن نہ تھا۔ اگر شاہ حاتم نہ ہوتے تو اردو میں سودا نظر نہ آتے اور اسی طرح اگر سودا نہ ہوتے تو مصحفی کا کوئی امکان نہ تھا۔ سب نے اپنے اسلاف سے کسب فیض کیا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ ان حضرات کے گھر میں

سارا سامان دوسروں کے گھر کا ہے اپنا کچھ نہیں الزام و اتہام تو کہا جاسکتا ہے نقد و نظر نہیں یا بقول رشید احمد صدیقی کے یہ آئین (تحقید) نہیں آرزو نہیں ہے سو اس حقیقت کو مد نظر رکھا جائے تو ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر عندلیب شادانی کے سارے دعاوی درست ہوتے ہوئے بھی چنداں اہمیت نہیں رکھتے اور اس کا سبب یہ ہے کہ تحقید میں تجزیہ بھی ہوا کرتا ہے لیکن تحقید محض تجزیہ نہیں ہوتی۔ یہ کام تو بڑے میکائیکی طریقے سے معمولی لیہار پٹری میں بھی ہو سکتا ہے جہاں حس و وجدان کا کوئی دخل نہیں۔ تحقید تو ایک جمالی پیکر کے جمالی ابعاد کے تعین کا نام ہے۔ لہذا اگر آپ کو تحقید کرنا ہے تو ادبی تخلیق کو اس کی کلیت میں دیکھنا اور پرکھنا ہوگا۔ جس نے بھی تاج محل دیکھا ہے اس کو معلوم ہے کہ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں کن کن اشیا کو جمع کر کے یہ صورت اور شکل دی گئی ہے اور پھر یہ اشیا کہاں کہاں سے لا کر جمع کی گئی ہیں ... لیکن حقیقت میں قابلِ داد و ستادیش تو تاج محل کا وہ تصور ہے جو اس کے الجھنتر کے ذہن میں ابھرا اور اپنے خال و خد کی باریک ترین تفصیل کے ساتھ کاغذ پر نکس پڑا ہوا۔ لہذا دیکھنا یہ ہے کہ غالب نے اپنی نثر میں جس خیال کی قشیل خوشی کی ہے وہ آپ کی جمالیاتی حس کا دامن پکڑ کر طلبِ کار حسین ہوتی ہے یا نہیں۔ الفاظ کے یہ انبار صرف ابوالفضل اور بیدل ہی کے آثار میں موجود ہیں۔ ممکن ہے اور بھی بہت سے معروف و غیر معروف فنکاروں کے آثار میں بھی موجود ہوں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا غالب کی سی چابک دستی، صناعی اور مہارت کے ساتھ کسی اور نے بھی ان بے جان، خاموش بے حس الفاظ کو استعمال کر کے حسنِ معنی اور حسنِ معنی کا ایسا سحر انگیز، پراثر، متحرک و گویا، تاج محلِ تعمیر کیا۔ اگر نہیں تو آپ غالب سے اس کے ذہن کی دڑاکی، جھیل کی بلندی، اور فنکارانہ صلاحیت کی فضیلت چھینے پر کیوں مصر ہیں۔ الفاظ کسی کی ملکیت نہیں ہوتے۔ یہ تو گونگے بے جان پتھر ہیں۔ ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں یہ پتھر کھ نہیں پڑتے۔ اس کے لیے فیبر ہالائق چاہیے اور غالب یقیناً وہ فیبر ہالائق تھے۔ میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ غالب کی فارسی نثر کا اسلوب ایک بڑا پُر شوکت اور اثر انگیز اسلوب نثر ہے۔ غالب سے پہلے بھی تقریباً ہر پڑھے لکھے فارسی



دان کو معلوم تھا اور ان کے دور کا ہر عالم فاضل بھی اس حقیقت سے واقف تھا کہ اس کے منافع کہاں، واقع ہیں۔ اگر غالب کے پیٹروں اور معاصرین میں سے صرف چند اہم ترین حضرات کو نظر میں رکھا جائے تو مرزا مظہر جانجانا، اور سراج الدین احمد خاں آردو سے لے کر سرسید تک ایک طویل فہرست بن جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر نے فارسی شطوط لکھے اور بعض کے شطوط طہامت پڑ بھی ہوئے۔ لیکن باوجود اس کے کہ وہ علم و فضل و فہم و فراست میں کسی طرح غالب سے کم نہیں تھے غالب کے مکتوبات کی سحر انگیز خوبی کو نہ پہنچ سکے۔ یہاں ممکن ہے ڈاکٹر محمد امجد کا ایک مختصر سا اقتباس اس امتیاز کی توجیہ کر سکے۔ وہ کہتے ہیں "غالب کی (فارسی) نثر کی دوسری ماہہ الامتیاز خصوصیت ان کا شعری لب و لہجہ ہے۔ انھوں نے نثر میں شعری طہاتم کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ شعری تسمیات، اصطلاحات، تشبیہات و استعارات وغیرہ اسی فراخ دلی سے نثر میں برتی گئی ہیں جیسے شعر میں۔ اس کی بنا پر ان کی نثر کا ہر ایہ شاعرانہ ہو جاتا ہے۔" اس پر ان کی بے بدل طہائی، بے پناہ نکند آفرینی، حیران کن بلندی فکران کے بیان کو اور بھی دلکش بنا دیتی ہے۔ نہیں۔ دل کشی ان کی نثر کے لیے درست لفظ نہیں۔ ان کی نثر ایک قسم کا سحر ہے جو ہر صاحب فکر پر یکساں اثر کرتی ہے۔ اس نثر کے پیچھے ایک بہت بلند ذہن ہے۔ ایسا ذہن جو قدرت صدیوں میں کسی ایک کو عطا کرتی ہے۔ چنانچہ یہی وہ ساری خصوصیات ہیں جن میں کوئی مکتوب نگاران کا مقابلہ نہ کر سکا اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے اعلان کردہ مکاتیب نگاری کے دستور العمل کی پیروی نہ کر سکے لیکن انھوں نے خط کو ایک دلکش ادب پارہ ضرور بنا دیا۔ یہی ان کے مکاتیب کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ ان کے مکاتیب باقاعدہ ادب عالیہ کا ایک گراں اثاثہ ہیں اور یہی ان کے مکاتیب کی خالی بھی ہے کہ وہ مکتوب نگاری کے خود اپنے نمائے ہوئے اور مسلمہ اصولوں پر پورے نہیں اترے۔

## کتبیات و مقالات

- ۱۔ "تلفیق تائید و دفعہ"۔ تالیف: علی اکبر دہلوی۔ چاپ شدہ: ستمبر ۱۳۳۷ھ
- ۲۔ "پارشریفہ"۔ ۱۳۶۸ھ۔ مطبع حاجی ولی محمد ہارسیم مطابق فرمائش عبدالرحمن خاں
- ۳۔ "قائب"۔ مصنفہ: سالیہ پری گارنگ۔ داتا گیلانی عبداللہ۔ پادشہ روضہ کراچی اشاعت: اگست ۱۹۹۸
- ۴۔ "کتبیات تتر قائب"۔ ۱۳۸۷ھ مطبع نول کشور
- ۵۔ "کتبیات تتر قائب"۔ ۱۳۸۷ھ مطبع نول کشور
- ۶۔ "نامہ ہائے فارسی"۔ قائب: مرتبہ علی اکبر ترقی۔ مطبوعہ: قائب: انجمنی دہلی
- ۷۔ "آجنگ"۔ مجملہ: یادگار قائب: کراچی۔ عرب و معرجم پتہ: روایت مطبع الاول ۲۰۰۳
- ۸۔ "آجنگ"۔ قائب: شیخ محمد اکرم۔ تا: شرح: خیر احمد۔ محمد علی رواد: مکتبی چوہا: انجمن
- ۹۔ "مطبوعہ قائب"۔ ڈاکٹر: علامہ رسول میر
- ۱۰۔ "ڈاکٹر قائب"۔ مصنفہ: ملک: رام۔ کتبہ: شعر و ادب: سن: آباد، لاہور
- ۱۱۔ "قائب"۔ شخصیت اور محمد: چمن کمار ورنہ۔ ادارہ: ادبیات اردو۔ چنڈ گڑھ۔ حیدر آباد۔ اظہار
- ۱۲۔ "عمود ہندی"۔ مرتبہ: مرتضیٰ حسین قاضی۔ مجلس ترقی ادب: لاہور ۱۹۹۷
- ۱۳۔ "عمود ہندی"۔ مرتبہ: مرتضیٰ حسین قاضی۔ مجلس ترقی ادب: لاہور ۱۹۹۷
- ۱۴۔ "تاریخ ادبیات"۔ سلطان: پاک و ہند۔ پنجاب: یونیورسٹی
- ۱۵۔ "تاریخ زبان فارسی"۔ مصنفہ: ڈاکٹر: غلام سرور۔ طابع: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان
- ۱۶۔ "تاریخ ادب"۔ مرتبہ: ڈاکٹر: غلام سرور۔ طابع: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان
- ۱۷۔ "آئینہ بہار"۔ ۱۱۹۸ھ۔ مصنفہ: سید: مانت علی۔ مطبع: انوار احمدی
- ۱۸۔ "قائب کی فارسی تتر فارسی"۔ (قائب پر چند مقالے)۔ پتہ: ضلع: خیر احمد
- ۱۹۔ مقالہ: مرزا: قائب کا اسلوب نگارش۔ ڈاکٹر: عبد: یحییٰ: گیلانی

## غالب کے دینی و نندہی عقاید

دنیا کا ہر شاعر، ادیب، مصور اور تخلیقی فن کار اپنے معاشرے سے شامی ہوتا ہے۔ اس معاشرے کا نظام اقدار و اخلاق ہی اس کو کلیتاً ہے معنی و فصول نظر آتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو بلکہ حقیقتاً اس کی وجہ یہی ہے کہ تخلیقی کار ہونے کے ناتے وہ اپنی چھوٹی سی دنیا کا ایک خدا ہوتا ہے اور اس لیے اپنی کائنات میں صرف اپنے نظام اقدار کو کار فرما دیکرنا چاہتا ہے۔ غالب بھی شاعر ہونے کے سبب وہی آنا نیست لے کر پیدا ہوئے جو ایک خدا کو زب و دینی ہے اور اسی لیے اپنی شریعت اپنے ساتھ لائے۔ نتیجتاً جس شریعت میں آنکھ کھولی اس کی طرف سے کلیتاً آنکھیں بند کر لیں اور اس کو درخور اعتنا نہ جانا۔ اور چوں کہ شاعر بھی عظیم تھے اس لیے ان کی فنا بھی اتنی ہی عظیم تھی۔ قول و فعل میں رقتی برابر فرق نہ رکھا کہ شان خداوندی کے خلاف تھا۔ اور ایسے عہد میں جب لوگ دین و مذہب کے خلاف شاعری میں بھی اپنی آزادانہ رائے کے اظہار سے گریز کرتے تھے، ہانگ و دل اعلان کیا کہ میں شراب پیتا ہوں اور روز پیتا ہوں، تمہارے نظام سزا و جزا پر ایمان نہیں رکھتا، تمہاری جنت بھلا میری زندگی کے دکھوں کا کیا مداوا کر سکتی ہے اور اگر میرے بس میں ہو تو ریاض رضوان کو بیچ بازار بیچ ڈالوں۔ غرض دین کی طرف ان کا بھڑکی رویہ وہی تھا جو ہمیشہ ہر عظیم تخلیقی فن کار کا ہوتا ہے۔ یعنی:

جانا ہوں ثواب طاعت و زہد

پر طبیعت اور نہیں آتی

گویا دیدہ و دروں پر یہ ظاہر کر دیا کہ حضرات میرا دینی رویہ کسی نادانگہی یا عدم ادراک کی بنا پر نہیں۔ ثوابِ طاعت و زہد کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، پند میری انا کو یہ تقلید گوارا نہیں اور اس لیے اس بے معنی جھڑپی سے اجا کرتا ہوں۔ اور پھر اپنے ادراک کے اور اپنی ذاتی شریعت کی فضیلت کے ثبوت میں انھوں نے جنت و دوزخ، حور و قصور، سزا و جزا، حلال و حرام، سے دانگنیں، طوطی و کوثر کے تمام تصورات کو یک قلم مسترد کر دیا۔ نتیجتاً ساری زندگی اپنی شریعت پر جو وسیع الشربہ، صلح کھل، حکمت انسانیت، مروت و ہمدردی اور آفاقی اخوت پر استوار تھی عملاً کار بند رہے اور شاعری میں بھی مسلسل ان ہی اقدار کا پرچار کیا۔ ”اختار و کردار کی یہ ہم آہنگی ہی ان کی شخصیت و فن کی خشتِ ازل ہے۔ غالب کا فن ان کی شخصیت کا بھی مکمل انعکاس ہے۔ مختصر یہ کہ ان کا انتہائی کامیاب تنقیدی مطالعہ اور محنت سے سرب کی ہوئی سوانح عمری بھی اپنے بارے میں ان کے اقوال و آراء کی تشریح سے باہر نہیں جاسکتی۔“ لہذا اگر ان کی شاعری اور سوانح کو مجموعی طور پر نظر میں رکھا جائے تو دینی عقاید کی طرف ان کے رجحانات کو دو وسیع خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو مجموعی طور پر دین کی طرف۔ دوسرا مخصوص رویہ دینی جزئیات یا مذہبی عقاید کی طرف۔ زیرِ نظر مضمون میں ان کے ان ہی دونوں رویوں کو دیکھتے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلے میں آپ کی خدمت میں ان کے مجموعی دینی رویے کی مثالیں پیش کرتا ہوں۔ یہ مثالیں ان کی شاعری سے بھی لی گئی ہیں اور ان کے مکاتیب سے بھی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے میں ان کا ایک وہ شعر پیش کرتا ہوں جو ان کی آفاقی اخوت پر دلالت کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ وہ مذہب کی بنا پر انسانیت کی تفریق پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

فقط یکدم اس شعر میں اسی آفاقی اخوت کا استعارہ ہے۔

بخت و جدل نبھائے ما یکدمہ جوی کامدراں

کس شخص اور بخل نزد کس سخن از خدک خواست

اور پھر کہتے ہیں کہ مذہب کی فرسودہ رسموں کو نہ صرف ترک کرنا بلکہ ان کی عملی حالات کرنا چاہیے۔

فرسودہ رسم ہائے عزیزاں فروگذار  
 دوسرے نوحہ خوان و بہ بلام عزا برقص  
 اسی طرح کہتے ہیں کہ دین ہم جیسے بالغ نظر لوگوں کے لیے نہیں یہ تو بے شعور و  
 ناگاہ لوگوں کے لیے ہے۔

بامن میاویں اسے پدر فرزندِ آذر راگر  
 ہر کس کہ شد صاحبِ نظر دین بزرگاں خوش نہ کرد  
 اب میں غالب کے وہ خیالات پیش کرتا ہوں جو سزا و جزا، طلال و حرام، دوزخ و  
 جنت، حور و قصور کوثر و طوبے، قماز و روزہ، وضو و طہارت یا اس قسم کے جزوی پہلوؤں کے  
 بارے میں ہیں۔ ان خیالات کا اتنی باقاعدگی اور تسلسل سے ان کی تخلیقات میں بیان ہوا  
 ہے اور ان کے اظہار میں خیال کے ایسے ایسے زاویے اور پہلو ہیں کہ بعض اوقات اگر  
 ایک عنوان کے دس اشعار بھی مثال کے طور پر پیش کر دیے جائیں تو یہ خیال دامن گیر  
 رہتا ہے کہ اس عنوان کی کج نمائندگی نہیں ہوئی۔ چنانچہ طوالت سے بچنے کی خاطر ان  
 جزوی موضوعات سے ایک دواور دو اور قاری کی مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

### حور و کوثر

با دوست ہر کہ ہادہ مخلوقات خورو عام  
 دامن کہ حور و کوثر و دارالسلام چیست

### جنت و بہشت

ہم کو مظلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن  
 دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

—————

سننے ہیں جو بہشت کی تریف سب درست  
 لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

—————

### بارغِ رضواں

مستائشِ مگر ہے زاہد اس قدر جس بارغِ رضواں کا  
وہ اک گلہ ست ہے ہم بے غمروں کے طاقِ لسیاں کا

### جنت

جنت نہ کند چارۂ افسردگی ما  
تغیر با اندازۂ دیرانی مانیت  
کوثرِ طوبے، بارغِ رضواں و شرابِ طہور

### برہان

رہبت زعبد تا حضور اللہ  
خواہی تو دراز کیمر خواہی کوتاہ  
ایں کوثر و طوبے کہ نشانے دارد  
سر چشمہ و سایہ ایست درمے راہ

واعظ نہ تم ہی نہ کسی کو پلا سکو  
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

رضواں چہ شہد و شیر بہ غالب حوالہ نبرد  
بے چارہ باز داد و مئے مشکبو گرفت

در مژدہ ز جوئے عسل و کارخ زعفران  
چیزے کہ بدل بنگلی ارزد مئے ناب است

خوش است کوثر و پاک است بادۂ کہ در اوست  
از آن رحتی مقدس درایں شمار چہ حظ

### احکاماتِ امر و نہی

لا تقربوا الصلوةَ و نہتم بطعام است  
و زامر یاد مانده کلو و شرب مرا

### صوم و صلوٰۃ

#### رباعی

در عالم ہے ذری کہ تلخ است حیات  
طاعت نواں کرد بہ امید ثبات  
اے کاش زحق اشارتِ صوم و صلوٰۃ  
بودی بوجود مال چوں حج و زکوٰۃ

### طہارت و وضو

تو بیک قطرہ خوں ترک وضو گیری و ما  
سبلِ خوں از مژہ رانم و طہارت نہ رود

#### نماز

افتادگی نماز دل ناتوان ماست  
درد سر قیام و قعودش نمانده است

### انکسار و تواضع

نکی زنت از تو نہ خواہیم مزد کار  
در خود بدیم کار تو ایم انکسار چیست

قماشائے گلشنِ قنارے چیدن  
بہارِ آفرینِ گلزار ہیں ہم

کھڑے جاتے ہیں فرشتوں کے گھسے پر ناحق  
آدی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا  
حلال و حرام

دلِ نصیحتِ ہمیں دیوے دوائے ما  
پانچوگاں حدیثِ حلال و حرام چھت  
مقصد طاعت

طاعت میں تار ہے نہ سے دانگیں کی لاگ  
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو  
مزدِ عبادت و بخشش سائے

### رباعی

آں را کہ علیہ ازل در نظر است  
ہر چند بلا بیش، طرب بیش تراست

فرق است میان من و منہاں در کفر  
بخشش دگر و مزدِ عبادت دگر است

### مشتاقِ نیاز

مخمرِ مکافات پہ غلہ و ستر آہ  
مشتاقِ عطا شعلہ زگل باز نہاںست



یہ تو شاعری کی بات ہوئی اس ہی دینی روپے کی طرف ان کے بہت سے واقعات  
اطلاعات و حقائق ان کی زندگی کے احوال و سوانح میں بھی ملتے ہیں۔

ج ”منا ہے کہ جب کرغل بدون کے رو برو گئے تو اس وقت نکلا  
پاپاخ ان کے سر پر تھی۔ انھوں نے مرزا کی نئی وضع دیکھ کر پوچھا۔  
دل تم مسلمان؟ مرزا نے کہا آدھا۔ کرنیل نے کہا اس کا کیا  
مطلب۔ مرزا نے کہا شراب پیتا ہوں سو نہیں کھاتا۔“

ج ”جج کا چھپا ہوا آزادوں کا کام نہیں ہے میں آدھا مسلمان کہ  
جس طرح قید کیشہ ملت سے آزاد ہوں اسی طرح بدنامی اور  
رسوائی کے خوف سے وارستہ ہوں۔ میری مدت سے یہ عادت تھی  
کہ رات کو فرنج (شراب) کے سوا کچھ کھاتا پیتا نہ تھا اور اگر وہ نہ  
ملتی تھی تو نیند نہ آتی تھی۔ اگر جوان مرد خدا دوست، خدا شناس،  
دو یا دل ہمیشہ داس چند و ستانی شراب جو رنگ میں فرنج سے مشابہ  
اور یو میں اس سے بہتر تھی، مجھے نہ بھیجتا تو میں ہرگز جانبر نہ ہوتا۔“

از دیرِ دلم وایہ ز ہر دری بخت  
از بادۂ تاب یک دو ساغری بخت  
فرزانہ ہمیشہ داس شکید بہ من  
آپے کہ برائے خود سکندری بخت

ج ”ساری عفریق و فجور میں گزری۔ نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا۔ نہ  
کوئی نیک کام کیا۔ دیکھی کے چند انفاس رہ گئے ہیں اگر چند روز  
بیٹھ کر یا ایما و اشارے سے نماز پڑھی تو اس سے ساری عمر کے گناہوں  
کی صفائی کیوں کر ہو سکے گی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ میں سوخند  
ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر  
رہتے ہیں۔ لا الہ الا اللہ لا معبود الا اللہ لا معبود الا اللہ۔“

ہے" ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تھا تو قلعے گئے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا تم نے کتنے روزے رکھے۔ عرض کیا پھر و مرشد ایک نہیں رکھا۔"

۱۰ "ایک روز میرے سامنے اسی قسم کے ایک واقعے پر نہایت افسوس کرتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمان کی نہیں ہے پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج اور تاسف ہوتا ہے۔"

مرزا کے فکری اور عملی رویے کو مجموعی طور پر نظر میں رکھیں تو لازمی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ لاکھ بے عمل کسی لیکن پھر بھی ان کے کچھ تو دینی و مذہبی اعتقادات ہوں گے۔ سو وہ اعتقادات کیا تھے۔ اس ضمن میں شیخ اکرام نے بڑا پامنی جملہ لکھا ہے کہتے ہیں۔

یہ "ایک اور دلچسپ مسئلہ مرزا کا مذہب ہے۔ ان کی تصانیف سے پتا چلتا ہے کہ انھیں مذہب سے دلچسپی عوام سے زیادہ رہی ہے۔" اور پھر اس تمہید کو دست دیتے ہوئے انھوں نے بتایا ہے کہ کس طرح انھیں مختلف مذاہب اور ان کے معتقدات و معارف سے گہری دلچسپی تھی اور کس طرح وہ مختلف مذاہب پر تالیف کی گئی اپنے دور کی مستند کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ گویا ان کے سارے اظہارات کے پیچھے وہ عملی ہوں یا عقلی، نثر میں یا نظم میں گہری فکر کا فرما تھی۔ گفتگو میں وہ لطائف و مطابقات ہوں، مکاتیب میں محض عرض احوال واقعی اور نظم میں صرف اشعار لیکن ان سب میں ان کی فکر ضرور شامل حال ہوتی تھی۔"

حالی نے "یادگار غالب" میں ص ۷۴ پر ان کے معتقدات کا خلاصہ کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔ "مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید و جود کی کو اسلام کا اصل اصول اور رکن رکین جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بظاہر اہل حال سے نہ تھے مگر جیسا کہ کہا گیا ہے سن احباب یا اکثر ذکر توحید و جود اُن کی شاعری کا عنصر بن گئی تھی۔۔۔ انھوں نے تمام عبادات و فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک تو توحید و جود اور دوسرے اہل بیت کی محبت۔ اور اسی کو وسیلہ نہایت جانتے تھے۔۔۔ اور

اکثر جس طرح حکمائے اسلام نے نصیم جسمانی سے انکار کیا ہے مرزا بھی اس کے قائل نہ تھے۔ "پھر ص ۷۶ پر فرماتے ہیں۔ "۳" اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا مگر زیادہ تر ان کا میلان طبع تشبیح کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیر کو وہ رسول خدا کے بعد تمام امت سے افضل مانتے تھے۔"

شیخ اکرام نے بھی ان کو متقدم اثنا عشری ہی بتایا ہے تہ اور بقول مالک رام لا "وہ ساری عمر کھلے بندوں اپنے شیعہ ہونے کا اعلان کرتے رہے اور اس میں ان کے مخالف سنی شیعہ دونوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے بزرگ تھے۔" یہ اعلانات بحیثیت تعداد اس سے زیادہ اور بحیثیت تو اثر اس قدر ہیں کہ ان کو کسی خاص جذبے یا میلان سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ گویا یہ ایک شاعر آزادہ کیش و رند مشرب کا آوازہ سرمستی و ہوسے سرشاری نہ تھا اور نہ ہی ان کو کسی خاص وقتی دنیاوی منفعت کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ پھر اگر ان دعوؤں کی پوری عمر کا قصین کیا جائے تو وہ غالب کی زندگی کے بیشتر حصے پر جس میں لڑکپن شامل ہے محیط نظر آتے ہیں۔ سو آج کا عقلیت پسند مزاج اس بات کا ثبوت مانگتا ہے کہ وہ حقیقتاً اثنا عشری تھے۔

ظاہر ہے اس کے ثبوت کے لیے سب سے زیادہ اہم شواہد تو ان کے اپنے بیانات ہی ہیں۔ لیکن ان کے اپنے بیانات کے ساتھ ساتھ Circumstantial evidence بھی کم اہم نہیں۔ اب اگر ان کے گرد و پیش کے حالات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ آبائی شیعہ نہ تھے بلکہ (شیخ اکرام) اور اس بات کا وہ خود بھی اعلان کرتے ہیں "مفرجام کار بہ نجف اشرف برسم و مزار آں را کہ از کیش آبا یم بدر آ و در دو بخود کشید بکرم، مستانہ جان و ہم و سر بیا لش قانہم۔" مولانا حالی بھی لکھتے ہیں کہ "۳" جہاں تک ہم کو معلوم ہے مرزا کے والد سنی ائمہ مذہب تھے۔" اور یہی بات مولانا محمد حسین آزاد نے بھی آپ حیات میں لکھی ہے۔ یوں تو ان کے نانہال کے حالات و احوال پہلے ہی نہ ہونے کی حد تک ہیں چہ جائے کہ ایسی مثبت شواہد جن سے ان کے اثنا عشری اثرات کے ثبوت ملتے ہوں۔ سو ان کی شیعیت کے شواہد وہاں بھی دریافت نہیں ہوتے۔ چنانچہ ان کی شیعیت کا ثبوت ان کے

اپنے اطالانے ہی رہ جاتے ہیں۔ سو آئیے دیکھیں وہ اطالانے کیا ہیں اور ان کو کہاں تک اثنا عشری بناتے ہیں۔

نواب ملاؤ الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ”میں موقعہ خاص اور مومن کامل ہوں۔ انبیاء سب واجب التحظیم اور اپنے اپنے وقت میں منغرض الاطاعت تھے۔ عمر علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ اللعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجتماعی بلکہ من اللہ علیہ علیہ السلام ہے۔ ثم حسن، ثم حسین، اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام۔“

ع بریں دہستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ امامت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ ”یا دگار غالب“

اب میں سید علی حسنین کے نام غالب کے ایک فارسی مکتوب کے طویل اقتباس نکا کر دو ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ یہ اقتباس غالب کے شیعہ عقیدے پر قول فیصل کا حکم رکھتا ہے۔

”۱) اصحاب رباعیات کے ضمن میں بات ہو جائے خدا یا میرا بیان مجھ مرشد کے خلاف (مزاج) نہ ہو۔ شروع کی تین تحریر شدہ رباعیات کا مضمون یہ تھا کہ حضرت علیؑ خلیفہ تھے۔ (لیکن) میرا یہ عقیدہ نہیں میں علی کو امام سمجھتا ہوں اور دوسروں کو خلیفہ۔ خلافت (وراصل) سلطنت اور ریاست کے مترادف ہے۔ عرب کی زبان میں دیکھیں یا حاکم کو خلیفہ کہتے ہیں اگرچہ خلافت کے لغوی معنی نیابت کے ہیں۔ مختصر یہ کہ نبی کے بعد حضرت علیؑ امام بلا فصل ہیں اور امامت من جانب اللہ ہوتی ہے اور علی امام ہیں، حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کے زمانے میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں بھی اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانے میں بھی اور یہ جو مشہور ہے کہ حضرت علیؑ، حضرت عثمانؓ کے بعد خلیفہ ہوئے تو یہ غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب امام برحق حضرت علیؑ رقتی رسول پاک کے بعد امام ہوئے تو انہوں نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو خلیفہ بنا کر حکومت کا کام ان کے سپرد کر دیا کہ مسلمانوں کو خطرات سے محفوظ کریں اور مسلمانوں پر حکومت کریں۔“

اس کے بعد (انہوں نے) عمر کو منتخب کیا اور اس کے بعد خلافت حضرت عثمانؓ کے سپرد کی۔ ان قبیلوں نے اپنے آپ کو ان کے حوالے کیا اور نبی اور امام کی اطاعت کی۔ عثمانؓ کے بعد مسلمانوں میں کوئی شخص حکومت کے لائق نہ مل سکا اور جس نے اس کی آرزو کی وہ بھی اس لائق نہیں تھا۔ لامحالہ امام وقت نے قضا کا کام خود سنبھال لیا اور مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے میں لگ سکے۔ بادشاہ اگر قاضی کے فرائض انجام دینے لگے تو اس کو قاضی نہیں کہتے۔ غرضیکہ یقیناً علیؓ ہی اپنے عہد میں امام ہیں لیکن بعد میں خلافت حضرت عثمانؓ سے بنی امیہ میں منتقل ہو گئی اور اس جماعت سے آل عباس کو بچتی اور ان دونوں گروہوں نے خلفائے راشد کے برعکس ظلم و ستم کیے اور خون ریزیوں کیں اور حضرت علیؓ کی امامت کو اور اولاد علی کو مٹایا اور آخر کو مار ڈالا۔“

درحقیقت جب تک سید علیؓ کے خطوط غالب کے نام اور غالب کے خطوط ان کے نام دریاخت نہیں ہوئے تھے، غالب کی ساری شیعیت ان کے اپنے دعوؤں کے علاوہ جو طویل نثری بیانات کی شکل میں کم اور مکتوبات کے اختتامی جملوں یا اشعار کی شکل میں زیادہ تھے، ان کی مدح علیؓ میں غلو کے سبب تصور کی جاتی تھی۔ عام طور پر شیعیت کے لیے خب علیؓ کو ہی کافی سمجھا جاتا ہے چاہے کوئی سنی عقیدہ کا کیوں نہ ہو۔ ”شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جو اپنی کتاب تحفۃ اشاعہ عشریہ کی وجہ سے شیعوں کی مخالفت میں کافی مشہور ہیں خود اپنا واقعہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے حضرت علیؓ کے فضائل بیان کیے تو میرا ایک طالب علم ناخوش ہو گیا اور اس نے مجھے شیعہ سمجھ لیا۔“ اگرچہ میں اس کو کوئی مستند دسکہ بندہ روئے نہیں سمجھتا اور وہ اس وجہ سے کہ عمومی تعصب سے قطع نظر اردو اور فارسی شاعری کی ابتدا سے آخر تک صاحب علم و عرفان سنی حضرات بھی جس طرح حضرت علیؓ کے باب میں عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہیں، وہ اہل تشیع سے کسی طرح کم نہیں۔ لیکن غالب کے ساتھ ایسا ہی ہوا اور مکاتیب میں کیسے کیسے اختتامی الفاظ اور جملوں نے مثلاً۔ ① ”غالب اشاعہ عشری حیدری“ بنام غلام حسین قدر علی گرامی ② ”بندہ علی ابن ابی طالب، اسد اللہ المتخلص الغالب“۔

امام محمد حسین نا خدا شیرازی (۱) "خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام بھی ہے مذہب حق والسلام والا کرام (۲)۔ علی علی کیا کر اور قارغ البال رہا کر۔ تمام مجروح۔ غرض ان اختتامی جملوں اور خطوط کے رخصتی اطلاعات نے حب علیؑ کے ساتھ مل کر بہت سے لوگوں کے ذہن میں یہ غما دیا کہ وہ اثنا عشری ہیں۔ لیکن قریبی عزیزوں اور دوستوں نے پھر بھی ان اطلاعات کو قبول نہ کیا۔ چنانچہ ان کے دفن کے وقت ۱۸ "سید صدر سلطان خیرہ بخشی محمود خاں نے نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم سے کہا کہ مرزا صاحب شیعہ تھے ہم کو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقے کے مطابق ان کی قبضہ و تکفین کریں۔ مگر نواب صاحب نے نہیں مانا اور تمام مراسم اہل سنت کے مطابق ادا کیے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب سے زیادہ ان کے مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں ہو سکتا تھا مگر ہمارے نزدیک بہتر ہوتا کہ شیعہ اور سنی دونوں مل کر علاحدہ علاحدہ ان کے جنازے کی نماز پڑھتے اور جس طرح زندگی میں ان کا برتاؤ سنی اور شیعہ دونوں کے ساتھ یکساں رہا تھا مرنے کے بعد بھی، دونوں فرقے ان کی حق گزاری میں شریک ہوتے۔" گویا غالبؒ کے اپنے قریبی عزیز بھی ان کے ان دعاوی کو ان کے فکری مصلحت نظر سے زیادہ اہمیت نہ دیتے اور ان کو شیعوں کے مروجہ و عملی معیارات کے مطابق اثنا عشری ماننے کو تیار نہ تھے۔ اور اس روپے کے فتنے وار بہت سے ایسے اسباب تھے جو متعدد وجہ بالا اطلاعات کے خلاف کارفرما نظر آتے تھے۔

ان کے اسباب میں سب سے پہلا امر تو یہی حقیقت تھی کہ غالبؒ کے ارد گرد قریب یا دور وادھیال یا ناہال میں کسی جگہ کوئی ایسا بیوند نہ تھا جو اثنا عشری ہو۔ پھر ان کی نسلی تاریخ کو نظر میں رکھا جائے تو یہ ممکن بھی نہ تھا۔ اس ہی حقیقت کا اظہار غالبؒ نے خود اپنی رباعی میں اس طرح کیا۔

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری  
کہتے ہیں مجھے وہ راضی اور دہری

دہری کیونکر ہو جو کہ ہودے صوفی  
شیعی کیوں کر ہو ماورائے نہری

جانی نے اس رہائی کے پڑھنے اور بہادر شاہ کو سنانے کا واقعہ لطیف کے عنوان کے تحت لکھا ہے جو اتفاق سے غالب کے دینی رجحان ہی کی نہیں غالب کی نسبت دوسرے لوگوں کے خیالات کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ یعنی غالب چوں کہ خود دین اور دینی احکامات و اعتقادات کی طرف انتہائی لاپرواہی رکھتے تھے اس لیے دوسرے لوگ بھی کہ ان کے دوستوں میں سے ہوں یا عزیزوں میں معتقدین میں یا پرستاروں میں ان کے اظہارات کو چنداں سمجھ نہ سکتے تھے۔ پھر واضح کاف تضادات کا شور بھی ہو تو یہ آواز اور بھی اشتکار کا شکار ہو جاتی ہے۔

اس ہی رہائی میں غالب خود ہی اپنے اثنا عشری نہ ہونے کا نہیں بلکہ نہ ہو سکنے کا دوسرا سبب یہ بتاتے ہیں کہ وہ صوفی بھی ہیں۔ اب صوفی جس طرح دہری نہیں ہو سکتا اسی طرح اثنا عشری بھی نہیں ہو سکتا۔ "غور کرنے کی بات یہ ہے کہ وہ شیعیت کے تمام مسلمہ تصورات کے برخلاف تصوف میں دلچسپی لیتے اور اس کا برملا اعلان کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا یہ اذعان صرف قول ہی کی حد تک نہیں۔ وہ حضرت مولانا فخر الدینؒ کے پوتے مولانا نصیر الدین عرف میاں کالے سے بیعت بھی تھے۔ کون کفر شیعی کسی غیر شیعی سنی صوفی کے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔" (مالک رام) اسی موضوع پر پھر مالک رام "ذکر غالب" ہی میں ص ۲۳۸ پر کہتے ہیں "شیعیت کو اگرچہ کلیہ کی حیثیت سے تو بے شک نہیں لیکن بالعموم تصوف سے ایک حد ضرور رہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں شیخ و بیعت کا تصور سرے سے مفقود ہے۔ بقول سید علی ہگڑای شیعہ حضرات کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے اس لیے حرج ہے کہ ان سے ان کی آدمی سلطنت چھین گئی۔ اگر ان حضرات صوفیہ کی تعلیم نہ ہوتی تو آج سب مسلمان شیعہ مسلک کے چرہ ہوتے۔ خیر یہ تو لطیف ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ شیعی صوفی نہیں ہو سکتا۔" ان حالات میں آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کو اثنا عشری کس طرح مان لیا جائے۔

ان کے شیعیت کے دعویٰ اس وقت تک ضرور ناقابل تردید رہے جب تک وہ  
 ”خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام“ اور بدعت علی تک محدود رہے۔

عالم ہے رجبہ فہم و تصور سے کچھ پرے  
 ہے بجز ہندگی جو علی کو خدا کہوں

اسد کیوں نہ ہو امید لطف بندہ نوازی  
 علی ولی اسد اللہ جانشین نبی ہے

اے اسد مایوس مت ہو از در شاو نجف  
 صاحب دلہا وکیل حضرت اللہ ہے

لیکن جب انہوں نے اپنا عشق مسلک رفتہ رفتہ اپنے مکاتیب میں زیادہ وضاحت  
 سے بیان کرنا شروع کر دیا اور جو قدرے دیر سے دریافت ہوا تو ان کی شیعیت کا جامہ بھی  
 چاک ہونے لگا۔ خلا حضرت جی ٹیکن کے مکاتیب میں وہ بڑے واضح طریقے سے کہتے  
 ہیں کہ ”من علی را امام و ائمہ و دیگران را خلیفہ۔ خلافت بعد از نبی امام است و امام  
 امریست جزوانی و علی امام است ہم در عہد خلافت ابوبکر و ہم عہد خلافت عمر و ہم در عہد  
 خلافت عثمان و امین کہ مشہور است علی بعد از عثمان خلیفہ شد غلط است اصل امین است کہ  
 امام برحق علی مرتضیٰ چوں بعد از رسول امام شد ابوبکر صدیق را خلیفہ کردہ امر قضاوی سے سپرد  
 تا قطع خطرات مسلمین نہاید و بر مومنین فرمان روا یا شد و پس از عمر را برگزیدہ و از و بعد عثمان  
 را خلافت داد۔ اس پر سرتن بداد و سپردند و نبی و امام را اطاعت کردند۔“ اس بیان میں نہ  
 صرف یہ کہ ”خلافت دینی اور مادی امور سے متعلق ہے اور امامت دینی اور روحانی  
 امور سے اور اسی وجہ سے من جانب اللہ ہے۔“ شیعہ عقیدہ نہیں بلکہ یہ سارا بیان کہ  
 حضرت علی نے تیوں خلفا کو خود مسند خلافت پر بٹھایا کہ مسلمانوں کو خطرات سے محفوظ  
 کریں اور ان پر فرماں روائی کریں، سبک بند شیعہ عقیدہ نہیں۔ بلکہ خلافت کے موضوع پر



ان کے بنیادی عقیدے کے بالکل خلاف ہے۔

ذکر غالب میں ص ۲۳ پر مالک رام غالب کی رباعی:

”شرطت کہ بر ضبط آداب و رسوم

خیزد بعد از نبی امام معصوم

تراجم چہ گوئی، بہ علی باز گرائی

مہ جائے نشین مہر باشد نہ نجوم

تحریر کر کے کہتے ہیں ”ہم ان کی شیعیت کی مختصر لفظوں میں یوں بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ اس کا امتیازی نشان حمزائیں بلکہ قولہ ہے یعنی وہ عموماً دوسرے صحابہ پر حمزائیں کرتے بلکہ حضرت علیؑ سے اپنے قولہ اور محبت کا شدت سے اظہار کرتے ہیں“ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مرویہ اثنا عشری مسلک میں حمزائیں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ورنہ منطقی طور پر غلطی بلا فصل کا دعویٰ غیر جانبداری اور نتیجتاً خاموش رضا مندی کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب آئیے دیکھتے ہیں کہ غالب کس حد تک صوفی تھے اور صوفیا کے نظام کے کس حد تک پیرو رہے۔ یہ بات اوپر بتائی جا چکی ہے کہ غالب حضرت مولانا فخر الدین کے پوتے مولانا فصیر الدین عرف میاں کالے سے بیعت تھے۔ جب کہ بہادر شاہ ظفر بھی ان ہی کے مرید تھے۔ غالب قید خانے سے باہر آنے کے بعد کئی ماہ تک میاں کالے ہی کے مکان میں قیام پذیر رہے تھے۔ اس کے علاوہ میاں کالے کو اپنے لیے اور ان کے مکان کو اپنے مال و اسباب کے لیے وہ ایک محفوظ پناہ گاہ بھی تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نذر کے دوران ان کی تنگم نے اپنا سارا قیمتی اسباب و زیور میاں کالے ہی کے گھر رکھوا دیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ان کی سوانح میں آچکی ہے کہ دربار ولی کی ملازمت بھی ان کو میاں کالے ہی کے ایما پر دستیاب ہوئی تھی۔ سو غالب کا صوفیا سے تعلق اس حد تک ہی ہماری معلومات کا حصہ رہا۔ البتہ وحدت الوجود اور اس سے متعلق موضوعات ان کی فکری دنیا کے محور و مرکز ضرور رہے لیکن فی الوقت ہم ان کی بات نہیں بلکہ طریقیت میں غالب کی عملی سرگرمی کی بات کر رہے ہیں۔ یعنی بیعت کے بعد آیا وہ یہ حیثیت ایک مرید

کے طریقت کے نظام عمل پر بھی کار بند رہے یا نہیں اور اپنے چہرہ مرشد کے ارشادات کے مطابق ان وظائف و ریاضات پر عمل پیرا رہے جو ایک عام مرید کے لیے عام حالات میں ضروری ہیں۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمیں اس بارے میں کسی قسم کے شواہد نہیں ملتے۔ البتہ ایسے شواہد ضرور ملتے ہیں جو مخالف سمت میں رہنمائی کرتے ہیں اور وہ ان کے اپنے ہی بیانات ہیں جو مختلف مکاتیب میں بکھرے پڑے ہیں۔ ”ہج“ ساری عرقشق و فہم میں گزری۔ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا۔ نہ کوئی نیک کام کیا۔ تصوف سے میرا کیا تعلق اور درویشی سے مجھے کیا نسبت۔ میرا حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وحدت وجود اور اشیا (موجودات) کا معلوم ہونا میرے خیر میں ڈال دیا گیا ہے اور عشق محسوس ہے اور خلق معقول، میرا عقیدہ بنا دیا گیا ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ صرف ایک موجود ہے اور اس کے سوا کچھ موجود نہیں ہے۔ اس کے سوا میری ہمت، کوشش و ریاضت اور دولت و مال ایک دو شراب کے پیناؤں پر منحصر ہے جو رات کو پی لیتا ہوں اور مست ہو کر سو جاتا ہوں۔ نہ دین سے واقف ہوں نہ دنیا سے۔ اللہ بس ماسوا ہوں“ (ترجمہ خط بنام حضرت جی غمگین)۔

ان تحریری و اقراری انکشافات و بیانات کے ساتھ ساتھ ان کی ساری زندگی کا رویہ نظر میں رکھا جائے تو ذہن اس یقین پر پہنچتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں درست ہے۔ ان کی شخصیت کا بڑا کمال ہی یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا بر ملا کیا اور کبھی چھپایا نہیں۔ ان میں تصنع و ریاکاری نام کو نہیں۔ ان کے اقوال و اعمال میں رشتی برابر فرق نہیں اور یہاں محمد ششی کا قول زریں دوبارہ پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ”ان کی بہت محنت سے مرحب کی ہوئی سوانح عمری بھی اپنے بارے میں ان کے اقوال و آراء سے باہر نہیں جاسکتی۔“ ان حالات میں اگر حضرت جی غمگین کو وہ ایک خط میں یہ لکھتے ہیں ”ہج“ سید امانت علی صاحب جو حضور کے تربیت یافتہ ہیں اکثر مجھے نوازتے رہتے ہیں اور جب غلطو میسر آتی ہے تو ان سے راز کی باتیں ہوتی ہیں۔ ابھی دو تین دن ہوئے بے رنگی کا ذکر آ گیا۔ چوں کہ میں آج کل بے رنگی کے نگارے میں مبتلا ہوں اس لیے میں نے اس

بارے میں مبالغہ کیا اور میں نے کہا اس سے بلند اور کوئی مقام نہیں ہے۔ میرا مات علی صاحب نے کہا کہ اس مقام کا چھوڑنا بھی ایک مقام ہے۔ میں نے کہا یہ صحیح ہے لیکن کہنے کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا مقام ہے جو استغراق کی زیادتی کے بعد خود ہی حاصل ہو جاتا ہے اور اس کا حاصل کرنا مشاہدہ بے رنگی پر توجہ کرنا ہے نہ کہ اس سے قطع نظر کر لی جائے۔ "قاری کے استفادہ کے لیے بتایا جائے ۶" کہ شغل بے رنگی صوفیا کا ایک خاص شغل ہے جو آنکھیں کھول کر آسمان یا خلا میں نظر بٹھا کر کیا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ بے خودی اور ربودگی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جسے فنا بھی کہتے ہیں اور جس کا حصول تمام سلاسل تصوف میں بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ وہ اپنے صوفیانہ عقاید کے علاوہ عملاً بھی صوفی تھے اور شغل بے رنگی ان کا معمول تھا" ان کی ساری زندگی کے حقائق سے منہ موڑ لینے کے مترادف ہوگا۔

اس کی بنیادی اور اہم ترین وجہ یہ ہے کہ کسی بھی مسلک صوفیا کے لیے کوئی عملی شغل ان کے محیط طریقت سے (جو اپنے طور پر خود شریعت پر استوار ہے) باہر نہیں ہو سکتا۔ یعنی یہ سارے ریاض، محاہدے اور روحانی مشقیں احکام طریقت کی چار دیواری کے اندر ہو سکتی ہیں اس کے باہر نہیں۔ بالفاظ دیگر ان اشغال کا کرنے والا پہلے عملی طور پر مسلمان ہوگا، اور پھر صوفیا کے کسی مستند سلسلہ سے منسلک ہوگا اور یہ مشقیں اپنے پیر و مرشد کی ہدایات و نگرانی میں کر رہا ہوگا۔ کسی عملی مسلمان کے لیے تو بنیادی شرط روزے نماز کی ہے۔ طریقت تو شریعت کا خصوصی انصاب (specialised course) ہے۔ جو شخص شریعت میں مبتدی کی حیثیت بھی نہ رکھتا ہو وہ ذات و صفات سے متعلق ایسے اعتنائی خصوصی کورس میں کس طرح شامل ہو سکتا ہے۔ کوئی تارک موم و صلوة اپنے آپ کو صوفی کہلانے کا مجاز ہی نہیں چاہے وہ اتنا دھماکا کے ایسے بلند مرتبہ کورس میں شامل ہو سکے اور پھر وہ "ایک دو شراب کے پیناؤں کے" دعوے کے ساتھ، جب کہ وہاں یہ ساری روحانی مشقیں بھی با وضو ہی کی جاتی ہیں اور طہارت کا بنیادی تصور بھی شریعت کا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خائبہ نے بے رنگی کی یہ یونٹورشی معیار کی مشقیں کس

طرح شروع کر دیں جب کہ وہ کسی مسلک کے کنڈرگارڈن میں داخلے کے بھی اہل نہ تھے۔ سو اس ضمن میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ میاں کالے سے ان کی بیعت اپنی تھک، جو اعلیٰ احسان مندی و توقیر فضل و کمال کے خانے میں ڈالے جانے کا استحقاق رکھتی ہے، تصوف صرف اک مسلک اور عقیدہ ہی نہیں ایک علم اور فلسفہ بھی ہے اور چوں کہ غالب مختلف مذاہب اور فلسفوں سے گہرا شغف رکھتے تھے اور ایک دژاک ذہن اور روشن دماغ کے مالک تھے ان کے لیے ہر فلسفہ کے باریک ترین نکات کو سمجھنا اور اس پر دسترس حاصل کر لینا آسان تھا۔ ان کا مختلف مذاہب خاص طور پر ہندوستان کے مختلف مذاہب کا علم یقیناً ان کا مشعل راہ تھا جہاں جس دم اور ارشکا (اور توجہ) کی مشقیں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ سادھوؤں کا ہزاروں سال کا وطیرہ رہی ہیں۔ اس قسم کی ریاضتیں بغیر اپنی دینی نسبتوں کے بھی دنیا میں مردج رہی ہیں اور چوں کہ ان باطنی علوم کا ہر طالب علم اپنے ریاض و مجاہدے میں تقریباً ایک جتنی منازل سے گزر رہا ہے، غالب نے بھی اپنی دینی کاوش اور فطری صلاحیت کی بنا پر بے رنگی میں وہ صلاحیت حاصل کر لی کہ وہ اس راہ کے منجیوں سے اس موضوع کے دقیق تجربات پر بحث کر سکیں، دوسرے کا مفہوم سمجھ سکیں اور اپنا مافی الضمیر سمجھا سکیں۔ یہی نہیں دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ روحانی واردات کے لیے کسی شاعر کا رہی طور پر صوفی ہونا لازم نہیں۔ بچے ”روحانی واردات کسی۔ کہ کلام میں بھی اسی طرح موجود ہو سکتی ہے جیسے صوفی کے کلام میں۔ اغلب یہ ہے کہ روحانی واردات کے لیے رندی اور وردیشی دونوں یکساں ہیں“ ۱۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے راہ سلوک کے سارے اکتسابات کسی بیعت یا مسلسل ریاضت کے مرہون منت نہ تھے بلکہ یہ ساری چیزیں ان کے غیر معمولی ذہن کی خدا داد صلاحیتوں اور ان کے فطری ذوق و میلان خاطر کے سبب تھیں جو کسی مذہبی یا دینی یا مسلکی پابندی کی برداشت کا حوصلہ ہی نہیں رکھتا تھا۔ اور اس لیے ان کو صوفیا کے کسی خاص مسلک سے کہ جو خالصتاً ایک دینی محیط کے اندر ممکن ہے وابستہ کر دینا غالب کی آزاد روی وسیع الشربتی اور بلند نگاہ انفرادیت کو مجروح کرنا ہوگا۔

اس ہی بات کو ذرا اور آگے بڑھاتے ہوئے اگر بعض ناقدین کی اس رائے پر غور کیا جائے کہ غالب اپنی ساری زندگی میں کس کس طرح اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے دکھانا بنا کر پیش کرتے اور اپنی بے آبروئی اور بے عزتی پر اپنا تسخر اڑاتے رہے اور اس سے ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ وہ مسلک ملاحچہ کے پیروکار تھے، ان کی شخصیت بلکہ ان کی بے کنار شخصیت کو اور بھی تنگ دائرے میں محبوس کرنا ہو گا۔

حضرت سید علی بن عثمان اللہجریؒ "کشف المحجوب" ۱۸۹۱ء میں ملامت کی تین اقسام بتاتے ہیں اور ان کے معلق یہ تحریر فرماتے ہیں۔ ملامت کی تین اقسام ہیں۔ ۱۔ راہ راست پر قائم رہنے کی وجہ سے ملامت کا نشانہ بننا۔ ۲۔ قصداً یعنی جان بوجھ کر ملامت کا نشانہ بننا۔ ۳۔ ترک شریعت کی وجہ سے بدنام ہو جانا۔

پہلی صورت یہ ہے کہ آدمی شریعت کے مطابق کام کیے جاتا ہے اور لوگوں کی مدح و ذم کی پرواہ نہیں کرتا لیکن پھر بھی لوگ اسے ملامت کرتے ہیں۔ قصداً ملامت طلب کرنے کی صورت یہ ہے کہ جب کسی بزرگ کی غلطی خدا میں بہت قدر و منزلت ہوتی ہے جس سے اس کے دل میں خود پسندی پیدا ہوتی ہے تو اس کا علاج وہ اس طرح کرتے ہیں کہ وہ ایسا کام کرتے ہیں جو شریعت کے خلاف نہ ہو لیکن لوگوں کو خلاف شرع نظر آئے۔ اس سے ان کو اطمینان قلب نصیب ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کا قرب نصیب ہوتا ہے۔ لیکن لوگ ان سے متنفر ہو جاتے ہیں اور ملامت کی زبان دراز کرتے ہیں۔ اور ملامت کی تیسری قسم یعنی ترک شریعت یہ ہے کہ کفر اور گمراہی میں ایک شخص جھکا ہو جائے اور شریعت کے خلاف کام کرے لیکن لوگوں سے یہ کہتا پھرے کہ میں نے طریق ملاحچہ اختیار کیا ہے۔" ظاہر ہے کہ ان تمام شرائط میں سے غالب کوئی شرط پوری نہیں کرتے اور اس لیے عینکی اعتبار سے وہ اس دائرہ سے بھی (جو تنگ ترین ہے) خارج ہیں۔

اس ساری بحث کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خالص اصطلاحی معنی کے اعتبار سے غالب صوفی بھی نہیں کہلائے جاسکتے۔ لے دے کے ایک چھوٹا سا مسئلہ عقیدہ یم حسرائی کا رہتا ہے۔ اس بارے میں جاتی لکھتے ہیں ۱۸۷۱ء "معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر خلفائے اسلام

نے ضمیمہ جسمانی سے انکار کیا ہے، مرزا بھی اس کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس خیال کو اپنے شاعرانہ انداز میں متعدد جگہ ظاہر کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن  
دل کے خوش رکھنے کو قالب یہ خیال اچھا ہے  
یہی خیال ایک فارسی رباعی میں اس طرح ظاہر کیا ہے۔

### رباعی

گردین زاہداں بہ جنت گستاخ  
واں دست درازی بہ ثمر شاخ بشار  
چوں نیک نظر کنی دروئے تشبیہ  
ماند بہ بہائم و علف زار فراخ

تقریباً یہی رائے شیخ محمد اکرام نے دی ہے۔ وہ کہتے ہیں ”مرزا کے کئی اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ روز جزا یا جسمانی عذاب و اجر کے قائل نہ تھے۔۔۔ جہاں کہیں انھوں نے بہشت کا ذکر کیا ہمیشہ شوخی اور تسکین سے کیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح دور عباسیہ کے کئی مسلمان حکما یا سرسید احمد خاں ضمیمہ جسمانی کے منکر تھے اسی طرح مرزا کی رائے بھی اس معاملے میں تمام مسلمانوں سے مختلف تھی۔“

بعض اہل الرائے نے مندرجہ بالا آرا کو قابل اعتقاد جانتے ہوئے اس موضوع پر تحقیق کی ہے اور قالب کے چند اشعار جنت کے عنوان پر ایسے پیش کیے ہیں جن سے قالب کی سنجیدہ طلب جنت کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً:

خلد بہ قالب سپار زانکہ جہاں روضہ در  
نیک بود عندلیب خاصہ نو آئیں نوا

یا

بر انتہ تو دوزخ جاوید حرام است  
حاشا کہ شطاعت نہ کنی سونچاں را

دھیرہ دھیرہ۔ لیکن جس طرح عاقی نے کہا ہے "شاعر کے کلام سے اس کے عقاید پر استدلال نہیں ہو سکتا۔" میں بھی اس رائے کو درغور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے شیخ اکرام کی پیش کی گئی رائے کے آخری جملے کو "جس طرح دور عباسیہ کے مسلمان حکمایا سرسید احمد خاں عظیم ہمسائی کے منکر تھے اسی طرح مرزا کی رائے بھی اس معاملے میں تمام مسلمانوں سے مختلف تھی" بہت اہم اور قابل قدر سمجھتا ہوں اور وہ اس سبب سے کہ وہ غالب کے مجموعی نظریہ دین و مذہب کی کلیتہاً تائید کرتی ہے۔

یہاں تک غالب کے دینی اعتقادات پر بحث کرنے کے بعد انتہائی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان عقاید سے متعلق غالب کے ذہن و احوال بھی پیش کر دیے جائیں۔ یہ دونوں واقعات یادگار غالب میں تفصیل سے درج ہیں۔ اور دینی و مذہبی اعتقادات کے بارے میں ان کے صلح لکھل یا غیر جانبدارانہ رویے کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں پر ان کا خلاصہ تحریر کیا جا رہا ہے۔

اب بہادر شاہ سخت بیمار تھے اور کسی طرح اتفاق نہ ہوتا تھا۔ مرزا حیدر شکوہ جو اکبر شاہ کے بھتیجے اور سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے، لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے مہمان تھے۔ وہ اثنا عشری تھے۔ ان کے ایما پر بادشاہ کو خاک شفا دی گئی اور بادشاہ کو اس سے اتفاق ہوا۔ اب انھوں نے نذر مان رکھی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہوئی تو حضرت عباس کی درگاہ پر لکھنؤ میں علم چڑھاؤں گا۔ چوں کہ ان کا مقدر نہ تھا انھوں نے اس ضمن میں بادشاہ سے عذر مانگی۔ بادشاہ نے روپیہ بھجوا دیا اور بڑی دھوم دھام سے لکھنؤ میں علم چڑھایا گیا۔ اس کے بعد دہلی میں یہ مشہور ہو گیا کہ بادشاہ شیعہ ہو گئے جس کا انھیں بہت رنج ہوا۔ نتیجتاً اس کے تدارک کے لیے ساری دلی میں اشتہارات چسپاں کروائے گئے اور بادشاہ کے حکم سے اس امر کے اعلان کے لیے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی بعنوان دین الہی اعلیٰ لکھی جس میں بادشاہ کو تشیع کے الزام سے بری کیا گیا تھا۔ لکھنؤ کے مجتہد انصاری کے اعتراض پر مرزا صاحب کا جواب یہ تھا کہ بادشاہ کا لازم ہوں۔ اس مثنوی میں حکم و مضمون بادشاہ و حکیم الحسن اللہ خاں کا اور الفاظ میرے تصور کیے جائیں۔

مولانا فضل حق کو جو مرزا کے بہت گہرے دوست تھے وہ انہیں اسے سخت کد تھی۔ چنانچہ انہوں نے مرزا سے فرمایا کہ اس کے امتناع نظر کے خاتم النہین کے مسئلے پر مثنوی لکھوائی۔ اس مسئلے میں مولانا اسماعیل شہید کی یہ رائے تھی کہ خاتم النہین کا مثل ممکن بالذات اور متعین بالغير ہے۔ متعین بالذات نہیں یعنی آنحضرت کا مثل اس لیے پیدا نہیں ہو سکتا کہ اس کا پیدا ہونا آپ کی خاصیت کے منافی ہے نہ اس لیے کہ خدا اس کے پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ برخلاف اس کے مولانا فضل حق کی یہ رائے تھی کہ خاتم النہین کا مثل متعین بالذات ہے اور جس طرح خدا اپنی مثل نہیں پیدا کر سکتا اسی طرح خاتم النہین کا مثل بھی نہیں پیدا کر سکتا۔ یہ مشکل مرزا راضی ہو گئے لیکن مرزا نے مثنوی کو ان اشعار پر ختم کیا۔

ہر کجا پنجم عالم بود

دست العالییہ ہم بود

کثرت ابداع عالم خوب تر

یا یک عالم دو خاتم خوب تر

در یک عالم دو تا خاتم بکوئے

صد ہزاران عالم و خاتم بکوئے

فضل حق آخری شعر پر سخت چراغ پا ہوئے اور انہوں نے کہا اگر لاکھ عالم بھی خدا پیدا کر دے خاتم النہین ایک ہی ہوگا۔ چنانچہ مرزا نے پہلے کہے گئے اشعار کے ساتھ کچھ اور اشعار بڑھا دیے اور مضمون کو اس طرح مربوط کر دیا۔

غالب ایں اندیشہ ہدیرم ہی

خود ہم بر خویش ی گیرم ہی

اے کہ شتم المرسلین خواندہ ای

دائم از روی تعلیمات خواندہ ای



این الف لائے کہ استغراق راست  
نعم فائق معنی اطلاق راست

مشاء ایجاد ہر عالم یکیت  
مگرد صد عالم بود خاتم یکیت

منفرد الحمد کمال ذاتی است  
لاجرم مثلش محال ذاتی است

ذی عقیقت بر مگردم والسلام  
نامہ را در می نوردم والسلام

”ناظرین کو معلوم ہوا ہوگا کہ مرزا کی طبیعت میں کس قدر سلامت روی تھی۔۔۔ احوالِ حاج سے کس قدر ان کا ذہن لاپرواہ تھا۔ اس طرح مرزا کی راست بیانی نے اس میٹھی رائے کے تمام بل نکال دیے اور بغیر اس کے کہ مرزا کو وہابیوں کی حمایت منظور ہو جو ٹھیک بات تھی ان کے قلم سے آخر تک پڑی۔ پھر اس کے بعد انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ جبراً لکھا ہے، وہ ان کے خیالات نہیں۔“

فرض یہ کہ ان کی شیعیت جو متداول اثنا عشری عقاید پر مبنی قائم نہیں صرف وہ ایم پہلو رکھتی ہے۔ پہلا حبِ علیؑ اور دوسرا عقیدہ امامت کا۔ اس میں حبِ علیؑ کا پہلو ان کی ذات کا وجدانی پہلو ہے جو غالب کو یہ حیثیت تمیز الرحمن پیش کرتا ہے۔ دوسرا پہلو جو حبِ علیؑ کی تصویر ہی کا دوسرا رخ ہے ان کی ذات کا فکری پہلو ہے۔ ان کے عقاید کے یہ دونوں پہلو ان کے خیمہٴ ذات کی وہ مضبوط ستائیں ہیں جنھوں نے ان کو ناقابلِ بیان تمدنی طوفان کے ہادی و سلاخ زمین پر استوار رکھا۔ اس عقیدے کا ہم ان کی خاک سے کس طرح چھوٹا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہو سکتا ہے عبدالصمد (برہنہ) کے قیام نے یہ بیج چھوڑا

ہو یا بقول حالی کے قوالب حسام الدین حیدر خاں اور بخشی محمود رضا خاں کے خاندانوں سے یہ ہونا پرہیزان چڑھا ہو کچھ ہی کسی لیکن اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اگر حب علی کی جڑیں ان کی ذات میں اتنی گہری نہ ہوتیں تو غالب جیسے مزاج کا آدھی صرف تکلیف کی ڈیوڑھی پر جان نہ دیتا بلکہ منکر خدا ہو کر قنبرا ایمان ہی سے گرداں ہو جاتا۔

رسی ان کے صوفی ہونے کی بات تو اس ضمن میں یہ عرض ہے کہ بھلے امیر خسرو، بیدل یا میر درد نہ کسی لیکن بیدل کے بعد فارسی شاعری میں اور ریختہ میں ابتدائے شاعری سے آج تک حیات و کائنات، نیم و درجا، حسن و عشق، رشک و حسد، وحدت و کثرت، مکان و لامکان، فنا و بقا، سزا و جزا، خیر و شر، عہد و معبود، خواہش و تمنا، جنون و حکمت، غریب و کسی بھی عنوان پر اسنے بلند پایہ، فکر انگیز و نایاب خیالات جتنے غالب کے کلام میں ملتے ہیں اور کہیں نہیں ملتے۔ مزید یہ کہ جہاں انھوں نے جمہوری طور پر اپنے کلام میں اظہار و بیان کے کلیتہاً نئے سانچے پیش کیے وہاں تصوف جیسے گھمے پنے روندے ہوئے اجڑے میدان میں اپنی عظیم انفرادیت اور بلندی فکر سے نئے گلزار کھلا دیے۔ ”انھوں نے تصوف کے رائج نظام کو سوال کی زد پر لا کر حقیقت اور سربسنت وحدت و کثرت ساپ اور رسی کے درمیان بھی ایک حقیقت کو ابھارا اور یہ سوال اٹھایا کہ کیا مشاہدہ کرنے والا بھی یعنی جسے شہود و شہود مشہود کا اور اک ہوتا ہے، اپنا ایک الگ وجود نہیں رکھتا... اور انھوں نے خواہش کو ایک Motive force یعنی محرک مان کر دیدانت اور تصوف کے سرچہ تصورات کے خلاف اس کی کلیت میں قبول کر لیا۔ اور اس طرح اس کو زندگی کی ایک مثبت قدر قرار دیتے ہوئے اس کی تکنیک تکمیل رہنے کے وصف ہی کو اصل حیات قرار دیا۔“

دین و مذہب ان کے لیے سب سے بڑا قید خانہ تھا۔ چنانچہ اپنی ذات کے لیے انھوں نے اس کو یکسر مسترد کر دیا اور عذر یہ پیش کیا کہ میری فطرت گنجی ہے بھلا طریقت عربی کو کس طرح سمجھ سکتا ہوں۔

رموز دیں نہ شناسم درست و معذورم

نہاد من گنجی و طریق من عربی است

اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے ایک واضح اشارہ اپنی کافرانہ تاریخ و ثقافت کا بھی دیا ہے جو حقیقت میں دین و مذہب کی دم کھوٹ دینے والی پابندیوں کے خلاف کسی رند مشرب منکر و نیکار کا انتہائی معقول جواز ہو سکتی ہے۔ اور جس کو شیخ اکرام نے مظلوم کی ایک طرح کی حکمن ازم Paganism کہا ہے۔ ان کی نظر میں دین و مذہب کے سارے تصورات خیر و شر کوئی قدر و ثقیل نہیں رکھتے۔ چنانچہ وہ بیابان و دل کہتے ہیں کہ "میش امرود" کی خاطر اگر میرے بس میں ہو تو میں ریاضِ رضوان بھی کھڑے کھڑے بازار میں بیچ دوں۔ سچ "تمام مظلوم میں ایک طرح کی حکمن ازم پائی جاتی ہے۔ وہ بیشتر میٹھ امرود کے قائل ہوتے ہیں۔"

ہلاک عشرتِ نقدم اگر دمن باشد

بچار سوائے فروشم ریاضِ رضواں را

عالم کی ساری زندگی کا اگر آپ پر نظر غائر مطالعہ کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ وہ صرف شکنائے غزل ہی سے ہراساں و پریشان نہیں تھی کعبہ نے سب سے بڑھ کر ان کا دم کھوٹ دیا ہے اور وہ کھلی فضا کی تلاش میں "وسعت بت خانہ ہائے ہندو جی" کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔

دلِ در کعبہ از تنگی گرفت، آوارہ خواہم

کہ ہاں وسعت بت خانہ ہائے ہندو جی گوید

اور یہ تاثر ہمیں ان کی تخلیقات ہی سے نہیں ان کی زندگی کے سارے رویے سے ملتا ہے۔ انسانی اقدار اعلیٰ کے سامنے دین و مذہب کی فرومانگی ان کی شاعری کا محبوب موضوع ہے اور اس کو انھوں نے طرح طرح سے ادا کیا ہے۔

دیر و حرم آئینہ شکرار قنار

داماد کی شوق تراشے ہے پتا ہیں

ہاں میاویز اے پدِ فرزند آذر را نگر

ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگان خوش نہ کرد

فرشتہ دین بہ حیثیت مجموعی ایسا لباس نہ تھا کہ ان کی قیامت پر موزوں ہوتا۔ رہے دینی اور مذہبی مخصوص اعتقادات تو ان کو بھی ان کی انفرادیت اپنی کلیت میں قبول کرنے کی قائل نہیں تھی۔ ان کو بھی وہ کائنات چھانت اور تراش تراش کے بعد قابل قبول بناتے تھے اس لیے کہ بہر حال انھیں اس ہی دنیا میں رہنا تھا جہاں اس قسم کی آلائشوں سے دامن بچانا ممکن نہ تھا۔ ”خلاصہ یہ کہ مرزا صاحب ایسے صوفی تھے جو وحدت الوجود پر مکمل ایمان رکھتا ہو اور شراب بھی پیتا ہو۔ اور ایسے سنی تھے جو حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کی خلافت کو حضرت علیؓ کا عطیہ مانا ہو اور حضرت علیؓ کو ہر حیثیت سے افضل سمجھتا ہو۔ اس طرح وہ ایسے شیعہ تھے جو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو خلیفہ بلا فصل نہ مانا ہو۔ اس طرح درحقیقت وہ آزاد رو تھے اور تقلید کو شاعری کی طرح مذہب میں بھی روا نہیں رکھتے تھے اور اپنی روش عام سے ہٹ کر چلنے کی عادت کو مذہب میں بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔“

## کتابیات و مقالات

- ۱۔ مقالہ محمد اسلم شمس منہ خلیا ہوت۔ چٹاوردی نند دینی غالب نمبر ۱۹۶۹
  - ۲۔ یادگار غالب۔ مصنفہ الطاف حسین حالی، دکنس پابلیکیشنز ۱۹۹۲۔ ادارہ یادگار غالب کراچی۔ ص ۳۹۔
  - ۳۔ یادگار غالب۔ ..... ص ۳۰۔
  - ۴۔ یادگار غالب۔ ..... ص ۵۴۔
  - ۵۔ یادگار غالب۔ ..... ص ۲۶۔
  - ۶۔ یادگار غالب۔ ..... ص ۷۵۔
  - ۷۔ آثار غالب۔ شیخ محمد اکرام چغتائی بیٹن۔ شیخ نذیر احمد مالک کتب خانہ تاج آفس محلہ رولہ بستی۔
  - ۸۔ یادگار غالب۔ مصنفہ الطاف حسین حالی، دکنس پابلیکیشنز ۱۹۹۲۔ ادارہ یادگار غالب کراچی۔ ص ۷۳۔
  - ۹۔ یادگار غالب۔ ..... ص ۷۶۔
  - ۱۰۔ آثار غالب۔ شیخ محمد اکرام چغتائی بیٹن۔ شیخ نذیر احمد مالک کتب خانہ تاج آفس محلہ رولہ بستی۔
- ص ۳۲۱
- ۱۱۔ ذکر غالب۔ مالک رام مکتبہ شعر و ادب سن آباد۔ لاہور ص ۲۲۲ و ۲۲۳۔
  - ۱۲۔ آثار غالب۔ شیخ محمد اکرام چغتائی بیٹن۔ شیخ نذیر احمد مالک کتب خانہ تاج آفس محلہ رولہ بستی۔
  - ۱۳۔ یادگار غالب۔ مصنفہ الطاف حسین حالی، دکنس پابلیکیشنز ۱۹۹۲۔ ادارہ یادگار غالب کراچی۔
  - ۱۴۔ یادگار غالب۔ .....
  - ۱۵۔ غالب کے منتخب فارسی مکتوبات ص ۲۱۷۔ مرتب و محترم چوہدری محمد ۲۰۰۹ روحانی آرٹس پریس اسلام آباد۔
  - ۱۶۔ مقالہ: میکش اکبر آبادی۔ مرزا غالب نمبر ۶۹۔ شاعر۔ بستی
  - ۱۷۔ ذکر غالب۔ مالک رام مکتبہ شعر و ادب سن آباد۔ لاہور ص ۲۲۲ و ۲۲۳۔

- ۱۸۔ یادگار کتاب۔ مختلف اصناف میں۔ علی گڑھ یونیورسٹی پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۲ء۔ یادگار کتاب کراچی۔ ص ۳۰
- ۱۹۔ ذکر کتاب۔ مالک رام مکتبہ شعر و ادب کن آباد۔ لاہور۔ ص ۳۲۹
- ۲۰۔ ذکر کتاب۔
- ۲۱۔ کتاب کے منتخب قاری مکتوبات ص ۳۷۔ عرب و عجم پرتو دہلی۔ ۲۰۰۹ء روحانی آرمٹ پریس اسلام آباد۔ ص ۳۷
- ۲۲۔ ذکر کتاب۔ مالک رام مکتبہ شعر و ادب کن آباد۔ لاہور۔ ص ۳۳۸
- ۲۳۔ ذکر کتاب۔ ص ۳۳۷
- ۲۴۔ کتاب کے منتخب قاری مکتوبات ص ۳۷۔ عرب و عجم پرتو دہلی۔ ۲۰۰۹ء روحانی آرمٹ پریس اسلام آباد۔ ص ۳۸
- ۲۵۔ کتاب کے منتخب قاری مکتوبات۔ ص ۳۶
- ۲۶۔ مقالہ نیکش اکبر آبادی۔ مرزا کا کتاب ایک سو فی صد کی حیثیت سے۔ کتاب نمبر ۳۹۔ شمارہ سبھی
- ۲۷۔ مقالہ کتاب نور صوفیہ۔ ص ۳۶۔ جمال احمدی۔ نقوش۔ کتاب نمبر ۱۱۱۔ فروری ۱۹۶۹ء۔
- ۲۸۔ شرح کشف المحجوب (۱۹۶۰ء)۔ تحقیق زبیر و شریعہ احمد بخش۔ سیل پبلیشنگ ملز، ملتان۔ اشاعت ۱۹۷۰ء۔
- ۲۹۔ یادگار کتاب۔ علی گڑھ یونیورسٹی پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۲ء۔ یادگار کتاب کراچی۔ ص ۳۱
- ۳۰۔ آثار کتاب۔ شیخ محمد اکرام چغتائی پبلیشنگ شیخ زبیر احمد مالک کتب خانہ جامع آف اسلامی سائنس۔
- ۳۱۔ یادگار کتاب۔ علی گڑھ یونیورسٹی پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۲ء۔ یادگار کتاب کراچی۔
- ۳۲۔ مقالہ (ڈاکٹر ذریعہ آغا)۔ کتاب نامہ دہلی۔ جولائی ۱۹۶۹ء
- ۳۳۔ آثار کتاب۔ شیخ محمد اکرام چغتائی پبلیشنگ شیخ زبیر احمد مالک کتب خانہ جامع آف اسلامی سائنس۔
- ۳۴۔ ص ۳۳۲
- ۳۵۔ مقالہ نیکش اکبر آبادی۔ مرزا کا کتاب ایک سو فی صد کی حیثیت سے۔ کتاب نمبر ۳۹۔ شمارہ سبھی

## والہ حیدر آبادی اور شرح اشعار غالب

غالب کا انتقال پندرہ فروری ۱۸۶۹ء مطابق دوسری ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ ہوا۔ جب کہ مولانا مولوی شیخ عبدالحی المتخلص بہ والہ حیدر آبادی کا انتقال ۱۳۱۱ھ میں ہوا۔ یعنی ان دونوں حضرات کی وفات میں صرف چھبیس سال کا فاصلہ ہے۔ اس لحاظ سے اگر شارح موصوف کی اپنی عمر، وفات کے وقت پچاس سال بھی رہی ہو تو وہ غالب کے ہم عمر نہ کسی ہم عصر ضرور تھے۔ چنانچہ اس قربت زمانی نے کہ شارح اور شاعر کے درمیان تھی مجھے مجبور کیا کہ ان کی اردو کلام کی شرح موسوم ”ذوقِ صراحت“ کو جو ان کی موت کے بعد ۱۳۱۳ھ میں چھپ کر تیار ہوئی، غور سے پڑھا جائے اور دیکھا جائے کہ غالب کے اردو کلام کے مطالب ان کی صمیم حیات اور موت کے اوائل میں اس دور کے خواندہ طبقے میں کیا تھے۔ یہ خیال مجھے اس مسئلہ حقیقت کے پیش نظر آیا کہ فاصلہ چاہے وہ زمانی ہو یا مکانی اشیاء کو نہیں خیالات اور تصورات کے ہیولوں کو بھی دھندلا دیتا ہے۔ اس لحاظ سے مولوی احمد حسن شوکت کی شرح کو بھی جو ۱۳۳۷ھ میں چھپی وہ فضیلت حاصل نہیں کہ جو ”ذوقِ صراحت“ کو ہے کہ والہ حیدر آبادی کی یہ شرح احمد حسن شوکت کی شرح سے چوبیس سال پہلے زیرِ طبع سے آراستہ ہو چکی تھی۔ اس پس منظر میں احمد حسن شوکت کا یہ دعوئی کہ ”از روزے کہ غالب جان بہ جاندار سپرد تا دور ہمسین ما کسے پادِ شعلہ زار جل نہوانست نہاد“ خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ”ذوقِ صراحت“ کا مکرر اُتیاز ہی یہ ہے کہ یہ غالب کے اردو کلام کی وہ شرح ہے جو ان کی شرحوں میں سب سے پہلے شائع

ہوئی اور جس کے شارح غالب کے معاصرین میں سے تھے۔ یہی اس شرح کی سب سے بڑی فضیلت ہے۔

”وثوق صراحت“ (۱۹۲) ایک سو پانچ صفحات پر مبنی ہے۔ اس کا دو صفحے کا دیباچہ والد حیدرآبادی کے بیٹے محمد عبدالواحد نے لکھا ہے اور بتایا ہے کہ ”اس خاکسار کے والد مرحوم جب نظام کالج میں بی۔ اے کلاس کو اردو دیوان مرزا غالب دہلوی پڑھاتے تھے تو اس کے ان مقامات پر جن کو شرح طلب جانتے تھے اور ایسی مشکلات پر جن کو حل کے قابل سمجھتے تھے شرح اور حل لکھ دیتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ نظر ثانی کے بعد خواب عماد الملک بہادر نظام تعلیمات کو اس کی شرح پیش کریں لیکن ان کا یہ ارادہ پورا نہ ہوا۔ اگرچہ اس شرح پر نظر ثانی نہیں کی گئی لیکن نظر اول ہی میں جو کچھ لکھا ہے نہایت نفیس اور قابل قدر ہے۔ کیوں کہ ایک فرد کامل، سخن گو، سخن دان، سخن فہم اور مسلم الثبوت استاد کی تصنیف ہے۔ اختصار کے ساتھ دقائق کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ مقصود قائل فوت نہ ہو۔ کہیں فوراً کہیں کچھ قوض (غوض) ہے سبب حیدرآبادی ہونے کے بخ کو ق لکھا ہے، مثال سے غالب علم کے ذہن فطین ہو جائے۔ حضرت مرحوم کی یہ عادت تھی کہ شرح کو بلا ضرورت ہرگز طول نہ دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ شرح مختصر مفید ہونی چاہیے۔“

”اب مجھ کو جو مرحوم کے دیوان اور انشاء کے چھپوانے سے فرصت ملی تو اس شرح کو بھی ساف لکھ کر اور اس کا تاریخی نام وثوق صراحت رکھ کر بغرض افادہ چھپوایا۔ امید ہے کہ مقبول خاص و عام ہوگی۔“

## الراقم

محمد عبدالواحد عفی عنہ

مندرجہ بالا دستور سے ہی قاری پر یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ یہ غالب کے کلام کی مکمل شرح نہیں بلکہ کہیں کہیں جہاں شارح نے ضرورت محسوس کی ہے وہاں ضروری معنی یا مطلب لکھ دیے ہیں۔ کہیں سرسری اشارے دے دیے ہیں اور کہیں غالب کے کلام کی فصیح بھی کر دی ہے۔ چنانچہ غالب کے اردو دیوان کی پہلی غزل ”نقش فریادی ہے رخ“



کے جس کے متداول دواوین میں پانچ اشعار ہیں، صرف دو اشعار پر معمولی سا نوٹ ہے اور دونوں جگہ مندرجہ ذیل طریقے پر استعمال شدہ الفاظ کے معنی دیے گئے ہیں۔

۱۔ جیرا ہن کاغذی: فریادیوں کا لباس جو قدیم میں دستور تھا۔ یہ کتاب ہے بجزو بے چارگی و علم و اداری سے۔

۲۔ (جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے) شوق: شوق عاشق جو شائقِ مقل ہے۔

اسی طرح غالب کے مندرجہ ذیل شعر پر یہ عبارت لکھی ہے:

کرے ہے بادہ ترے لب سے کب رنگِ فروغ

خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلِ جبین ہے

”لب کی جگہ رخ بہتر ہے کیوں کہ تشبیہ گل کی لب سے مسوم نہیں“

لیکن ان سارے امور کے باوجود اس شرح میں بہت سے ایسے مطالب اور خیالات ہیں جو شروع متداول سے یکسر مختلف ہیں۔ ان میں سے چند ایسے ہیں کہ ان سے اتفاق کرنا طبیعت پر گراں معلوم ہوتا ہے لیکن چند ایسے ہیں کہ تسلیم شدہ خیالات پر بہت گراں قدر اضافہ ہیں۔ اور تمام امور کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے خیال کیا کہ سمجیدہ غالب شناسوں کے لیے ان متنازعہ فیہ اشعار کے مطالب کا بیان اس ضمن میں ایک بڑی ادبی خدمت ہوگی۔ خاص طور پر ایسے وقت پر کہ ان کی پیدائش کی دو سو سالہ سالگرہ کے زمرے تا حال فضاؤں میں گونج رہے ہیں۔

۱۔ دُھم نے داو نہ دی تھی دل کی یارب

تیر بھی سیڑھِ بسمل سے پڑ افتخاں نکلا

غالب نے خود بھی اپنے اس شعر کی تشریح کی ہے اور کہا ہے ”دُھم تیر کی توہین پر سبب ایک رخسہ ہونے کے اور تنویر کے دُھم کی حسین پر سبب ایک طاق سا کھل جانے کے ہوتی ہے۔ تیر تھی دل کی داد کیا دیتا وہ تو تھی دل سے گھبرا کر پر لٹاں اور سر اسیرہ نکل گیا۔“ غالب کے مستند شارحین نے اس شعر کی شرح اسی طرح غالب کے اشعار میں کی ہے۔ اور مسئلہ مطالب سے ثابت ہوتا ہے کہ اس شعر میں فکر کی ساری عمارت تھی دل پر اضافی معنی

ہے لیکن والد نے اس ذیل میں ان مطالب کو بڑا خوب صورت رنگ دیا ہے۔ انہوں نے تنگی دل کی تشریح اس طرح کی ہے ”تنگی دل جو تنائے حیر میں تھی“ کو یہ تنگی دل ہی تھی اس حیر کے لیے اور چوں کہ اس کی حدت ناقابل برداشت تھی اس لیے حیر بھی سراسیمہ و پریشان باہر نکل گیا۔ آپ محسوس کریں کہ محبوب کے حیر کے دل سے آ رہا ہو جانے کے خیال کا تنگی دل سے رشتہ جوڑ کر غالب نے کیا خوب صورت عمارت بلند کی ہے اور شارح نے اس تنگی دل کو تیرے وابستہ کر کے اس کو مزید کس قدر دل آویز بنا دیا ہے۔

۲۔ ہے نو آموز فتا بہت دشوار پسند

سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا

والد نے اس شعر کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے ”یعنی اپنی بہت دشوار پسند ہے یا آنکہ نو آموز فتا ہے آسانی سے مرحلہ فتا کو طے کیا۔ یہ کام آسانی سے سرانجام پاتا بڑی مشکل بات ہے کہ ہر ایک سے ہو نہیں سکتا۔“ ان مطالب میں یہ جملہ کہ یہ کام مشکل سے شروع ہوتا اور ہر ایک سے ہو نہیں سکتا پر ختم ہوتا ہے ”حد اول شروع اور مسئلہ مطالب کے خلاف ہے۔ اس کے مسئلہ مطالب یہ ہیں کہ فتا جیسی منزل تو میں نے ابتدائے عشق ہی میں حاصل کر لی۔ اب اپنی طبع دشوار پسند کے لیے کون سا مرحلہ تلاش کروں، سخت مشکل میں ہوں۔

۳۔ کاوش کا دل کرے ہے کاخا کہ ہے جنوں

ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا

اس شعر کے ضمن میں والد نے صرف اس قدر لکھا ہے ”گرہ میں زر باندھنے کی وجہ سے لفظ قرض مناسب گرہ ہے۔“ مجھے یہ خوب صورت اشارہ تمام موجودہ شرحوں پر ایک اضافہ معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر کی تشریح پر فیسرفوسف سلیم چشتی نے نہایت مناسب کی ہے لیکن وہ بھی اتنا کہہ کر ٹوک گئے ہیں۔ گرہ نیم باز کہنا یہ ہے دل سے۔ دل کو گرہ اس لیے قرار دیا کہ تنگی یا غم طے سے دل گرہ ہو کر رہ گیا ہے۔ ”یہ تصور کا صرف ایک رخ ہے اور وہ بھی کنایہ کا بھردنی رخ۔ اس کا معنوی رخ وہ ہے جو والد نے بتایا ہے۔ چنانچہ یہ دل

کہ کاوشِ ناخن کا لذت چشیدہ ہے، ناخن سے پھر کاوش کا تقاضا کر رہا ہے کہ یہ ناخن پر یہ حیثیت ناخن ہونے کے قرض ہے۔ اب تقاضا اور فرض کے تلازمات کے علاوہ خوب صورتی کٹائی کی یہ ہے کہ گرہ میں زر ہوتا ہے۔ ناخن نے اس کو آدھا کھول کر پا کر پھوڑ دیا۔ اب عشق کی اذیت پسندی تقاضا کر رہی ہے کہ اسے ناخن اس گرہ زر کو پورا کھول۔ اس عمل سے جہاں عاشق کی اذیت پسندی کو تسکین ملے گی وہاں لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ یہ دل نہیں کاٹن زر ہے اور اس کو جس قدر کر دیا جائے گا اتنا ہی اس سے سونا برآمد ہو گا۔ سو اس میں خود مستانی کا بھی ایک واضح پہلو ہے جو غالب کی شاعری کا بڑا اہم عنصر ہے۔

۳۔ گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھانوں فریب

آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں مخمر کھلا

اس شعر کے مطالب میں والد نے صرف اس قدر لکھا ہے "دشنہ = کھائی۔ نشتر = قصد

دیوانہ کے لیے ہے۔"

شعر کے مطلب میں کسی قسم کا اشکال نہیں لیکن والد نے دشنہ کے لیے کھائی لکھ کر صاف بات کو الجھک کر دیا ہے۔ دشنہ کھائی کا کٹنا یہ تو ہو سکتا ہے لیکن یہاں وہ بھی نہیں ورنہ شعر بے معنی ہو جائے گا۔ نہ معلوم موصوف کے ذہن میں اس شعر کے کیا مطالب تھے۔

۵۔ تمیوں اندھیری ہے شبِ فہم، ہے بلاؤں کا نزول

آج ادھر ہی کو رہے گا دیدارِ اختر کھلا

اس شعر کے مطالب میں والد نے صرف اس قدر لکھا ہے۔

"اختر = طالع بد" لفظ اختر کے یہ معنی محل نظر ہیں۔ خاص طور پر اس لیے کہ بظاہر

پورے شعر میں اس کا کوئی قرینہ نظر نہیں آتا۔ تمام حدود اور شروح کو مد نظر رکھیں تب بھی اختر کے معنی ستارے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ چنانچہ "طالع بد" والی بات بھری فہم سے بعید ہے۔ ہو سکتا ہے والد نے اس کے معنی کٹنا لیے ہوں۔ اس لیے کہ ستارے بھی آج "ادھر" کو دیکھ رہے ہیں اور اس لیے ساری روشنی اس طرف ہے اور شبِ فہم اندھیری ہے

اور بلاؤں کا نزول ہو رہا ہے۔ اگرچہ یہاں اس کا عمل نہیں لیکن چلتے چلتے لفظ ”ادھر“ کے بارے میں بھی دو باتیں ہو جائیں۔ اکثر شارحین نے اس لفظ کو ادھر سمجھی آں جایا آں طرف تصور کر کے اس کی شرح کی ہے اور سب یہ کہتے ہیں کہ ستارے اُس طرف اس لیے دیکھ رہے ہیں کہ آسمان سے بلاؤں کا نزول ہو رہا۔ جن کے اترنے کا قشادہ دیکھنے کی غرض سے ستاروں کا رخ زمین سے آسمان کی جانب پھر گیا ہے (حسرت موہانی و مولانا نعم جب کہ صرف اسی لکھنوی اس کو ادھر یعنی اس طرف پڑھنے پر مصر ہیں اور کہتے ہیں کہ مصنف اعتراضاً کہتا ہے کہ شبِ غم اس قدر تاریک کیوں ہے حالانکہ آج بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور دیدہ اختر غمست بھی (والہ کے ساتھ ان کا ”طالع بد“ کے معنی میں اشتراک ہے) ادھر ہی کو نکلا رہے گا۔ جس سے تاریک نہ ہونا چاہیے۔ کیوں ازراہ اعتراض ہے کہ طریقِ سوال۔ ”اگرچہ میں اسی لکھنوی کی بات پورے طور پر سمجھ نہیں سکا۔ پھر بھی میں نے آپ کو جملہ لفظ ادھر کا متداولہ شروع کا پرتاؤ دیا۔ میری اپنی نظر میں اس شعر مطلب صرف اس وقت صاف ہوتا ہے جب قاری اس شعر کے مفروضات تک پہنچ سکے۔ اگرچہ یہ مفروضات بہت ہی سامنے کے ہیں اور ان میں تحقیق و تدقیق کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اب شعر پڑھیے۔ شاعر کی شبِ غم کب ہوتی ہے۔ جواب ہے جب اس محبوب اس کے پاس نہیں ہوتا۔ اس شبِ غم میں تاریکی تو ہوتی ہی ہے لیکن اس میں شدت کب ہوتی ہے۔ جواب ہے جب محبوب رقیب کے پہلو میں ہوتا ہے۔ سو یہ ستارے رقیب کے پہلو میں محبوب کو دیکھنے میں لگے ہوئے ہیں اور ظاہر ہے یہ موقع بھی ایسا ہی ہے کہ ساری ”روشنی“ ادھر ہی ہو۔ ایسے حالات میں شاعر کی رات بھی اندھیری ہوگی اور اس میں بلاؤں کا نزول بھی ہوگا اور رقیب کی کامیابی اور کامرانی پر ستاروں کی آنکھیں بھی ادھر ہی ہوں گی۔ میری دانست میں اس شعر کا یہی صحیح مطلب ہے۔

۶۔ بچہ مت رسوائی انداز استغنائے حسن

دست مرہونِ حنا، ریشہ رنجنِ غارِ حنا

اس شعر کے ضمن میں والد نے ”رسوائی انداز استغنائے حسن“ کے سامنے یہ لکھا ہے

رسوائی عاشق با ستغنائے معشوق حنا اور غازہ کے سبب کہ ان دونوں کو بوسہ دے نہیں سکتے بلحاظ گزرنے رنگ کے۔" یہ مطالب سننے ہی نہیں انوکھے بھی ہیں۔ والد نے یہ رسوائی بظاہر عاشق کے سرفزالی ہے جو ہاتھ کا یا رخسار کا بوسہ لے کر اس لیے رسوا ہو گا کہ حنا اور غازہ کے رنگ خراب ہو جائے گا۔ یہ مطالب دور از کار ہی نہیں شعر کے تمام قرائین کے خلاف ہیں۔ شعر میں تو رسوائی انداز استغنائے حسن کی ہے اس میں بیچارہ عاشق کہاں آگیا۔ دوسرے بوسہ کی وجہ سے غازہ اور حنا کے رنگ کا خراب ہونا بھی دور از کار ہے اور پھر عاشق کی رسوائی کا اس میں در آنا انتہائی بے معنی بات ہے۔ غرض یہ کہ یہ معنی آج تک کسی اور شرح میں میری نظر سے نہیں گزرے۔

۷۔ ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو بیچنے کا حرا کیا

اس شعر کے مطالب اس طرح لکھے ہیں "مرنا۔ فدا ہونا۔ نہ ہو مرنا تو بیچنے کا حرا کیا۔ فدا ہونا یا ر پر کہ مر جائیں تو ہوس کی بازیوں سے رہائی ہو۔ اس وقت زندگی کا شرہ پایا۔" یوں تو شعر کے مطالب میں کوئی اشکال نہیں لیکن والد نے مرنا سے فدا ہونا یا عاشق ہونا مطلب لکھ کر اس شعر کو اور بھی نکھار دیا ہے۔ اگرچہ اس کے آگے جو کچھ تشریح کی گئی ہے وہ چنداں جالب نظر نہیں۔

۸۔ تمنائے زباں کو سپاس بے زبانی ہے

مٹا جس سے قضا شکوۂ بے دست و پائی کا

اس شعر کے مطالب میں بظاہر کوئی اشکال نہیں۔ سب شارح اس کے مطالب پر متفق نظر آتے ہیں لیکن والد نے "بے دست و پائی" کو اپنے لغوی معنی میں لے کر ایک عجیب و غریب تشریح کی ہے کہتے ہیں "ہماری بے دست و پائی متعین حصار کی تشریف آوری کی تھی، ہمارے ہماری بے زبانی نے یہ قضا بھی کرنے نہ دیا، اور بے زبانی کی سپاس گزار ماری تمنائی زبان ہے۔" دوسرے تمام شارحین نے بے دست و پائی کو بے چارگی اور اجزی کے معنی میں لیا ہے۔

۹۔ وہاں ہر بہت پیٹارہ جو زنجیر رسوائی

عدم تک ہے وفا چاہے تیری ہے وفا کی کا

ہوں تو خیال اور مضمون کے لحاظ سے یہ شعر غائب کی فضولیات میں آتا ہے لیکن والد نے اس شعر کی وضاحت بڑے اچھے طریقے سے کی ہے۔ کہتے ہیں ”حلقہ وہاں ہر بہت طعنہ جو کا باہم مل کے زنجیر رسوائی ہو گیا۔ اس مصرع کے موافق ”حلقہ ہر حلقہ چواقد و وہاں زنجیر است“ فارسی کے اس معروف مصرعے نے شاعر کے مضمون میں بھی جان ڈال دی ہے۔

۱۰۔ گر نگاہ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط

شعلہ شمس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

تقریباً تمام شارحین نے نگاہ گرم سے نگاہ غائب مطلب لیا ہے لیکن والد نے نگاہ گرم کے معنی نظر مہر لکھے ہیں نہ جو گرم اور شعلہ کی رعایتوں کو نظر میں رکھتے ہوئے مناسب نہیں معلوم ہوتے۔

۱۱۔ کیا وہ ضرور کی خدائی تھی

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

اس شعر کی شرح حالی کی چر دی میں سب شارحین نے یہ کی ہے ”میری بندگی کیا ضرور کی خدائی تھی کہ اس سے مجھے سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت (پرستش) نہیں ہے بلکہ (عبودیت) بندہ ہونا ہے۔ بندگی پر ضرور کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل جی بات ہے“ مندرجہ بالا شرح کے خلاف والد نے بندگی سے مراد صنم کی بندگی لی ہے اور لکھا ہے کہ ”صنم کی بندگی میں اپنی بھلائی جو نہ ہوئی گویا صنم کی صاحبی ضرور کی خدائی تھی جس سے پرستاروں کا بھلا نہ ہوا۔“

۱۲۔ یک الف میں نہیں میقتل آئینہ جنوز

چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

اس شعر کی شرح والد نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے ”میقتل سے جو خط آئیے پر

پڑتا ہے وہ ہو بہو الف کے مانند ہوتا ہے تو محظوظ کو راہی الف ہی کی مشق کر رہا ہے۔ جنور روز اقل ہے۔ مگر چاک گریبان اپنا کہ وہ بھی بصورت الف تھا سیکڑوں شکلیں اس کی بدل گئیں تو معلوم ہوا کہ مشق گریبان وری میں آئینہ بنتی ہے۔ اور حضرت غالب کا گریبان مٹتی۔ "ظاہر ہے کہ اردوئے معلیٰ میں غالب کی شرح کی موجودگی میں والد کی شرح باطل ہے۔ غالب کی شرح میں آئینہ اپنے دل ہی کا کنایہ ہے۔ یہ کوئی فریق مقابل نہیں۔

۱۳۔ سفر عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی

ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

متدبجہ بالا شعر کے پہلے مصرعے کے تین الفاظ کے نیچے ۲، ۱ اور ۳ لکھ کر دوسرے مصرعے کے تین الفاظ کے نیچے بھی اسی طرح ۲، ۲ اور ۳ لکھ دیا گیا ہے اور نیچے اشارے کے طور پر والد نے صرف دو الفاظ لکھ دیے ہیں۔ لف وشر مرتب۔ اب آپ غور کریں تو دیکھیں گے کہ سفر عشق کی مناسبت سے دوسرے مصرعے میں قدم، ضعف کی مناسبت سے سایہ اور راحت طلبی کی مناسبت سے شبستاں ہے۔ مجھے یقین ہے کسی شارح کی غالب کے اس شعر میں اس خوب صورت صنعت رعایت لفظی کی طرف نظر نہیں گئی ہے۔

۱۴۔ بجلی اک کوئٹہ گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہ میں لب سمجھ تھریر بھی تھا

اس شعر کے اشارے بڑے دلچسپ اور انوکھے ہیں۔ "بجلی = یہ کنایہ چمک سے دانتوں کی ہے بات کرنے میں۔ بجلی کو باران لازم ہے۔ باران تراوش تفریر کو قرار دیا ہے۔ جو چارہ لب لفظی ہے۔ "ظاہر ہے کہ غالب کے شعر کی یہ بالکل نئی تخریج ہے۔

۱۵۔ شوق ہے ساماں طراز نازش اور باپ عمر

ذره سحرا و شگاہ و قطرہ دریا آشنا

یوں تو اس شعر کے معنی والد نے بھی دی کیے ہیں جو اکثر شارحین نے بیان کیے ہیں۔ لیکن اس میں تخریج کا آخری جملہ کہ جو رعایت لفظی کی طرف توجہ دلاتا ہے خاص

طور پر دلچسپ ہے۔ ”لفظ آشنا ضد بیگانہ و بمعنی شائستہ ایہامی و لفظ و مناسب دریا ہے۔“ شعر کے اس پہلو پر شاید کسی شارح کی نظر نہ گئی ہو۔

۱۶۔ جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہ مضطرب و داغ

سر کرے ہے وہ حدیث زلف عنبر ہار دوست

اپنے مضمون اور خیال کے لحاظ سے یہ شعر بھی فضولیات غالب میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ تمام شارحین نے اس کا وہی مطلب بتایا ہے کہ جو اس کے الفاظ سے بظاہر نکلتا ہے۔ لیکن والد نے یہ کہہ کر عنبر مضطرب و داغ ہے بظاہر خیال کے دو بے ربط ٹکڑوں میں ربط پیدا کر دیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے مضطرب و داغ کی بات عنبر کی اس ہی خصوصیت کی بنا پر کی ہوگی کہ یہ باتیں اس زمانے کے محاسن شعر میں شمار ہوتی تھیں۔

۱۷۔ لرزتا ہے مرا دل زحمت مہر درخشاں پر

میں ہوں وہ قطرہ شبنم کہ ہو خار بیاباں پر

شعر کا مسلہ مطلب تو یہی ہے کہ میرا دل جو بذات خود انتہائی تپا سیدار ہے کہ نوک خار پر ایک قطرہ شبنم ہوں اور خود بخود دغا ہو جاؤں گا بھلا مجھ کو مٹانے کے لیے مہر درخشاں کیوں زحمت کر رہا ہے۔ اس مضمون میں بھی غالب نے لفظ لرزتا لا کر اپنی غالییت ثابت کی ہے اور وہ اس طرح کہ بوقت طلوع سورج بھی لرزتا اور نوک خار پر قطرہ شبنم بھی لرزتا نظر آتا ہے۔ قطع نظر ان مطالب کے اب والد کی تشریح پر ہمیں تو احساس ہوگا کہ انھوں نے وہ بات کہی ہے جو قائل قبول نظر آتی ہے کہتے ہیں۔ ”فکر حشنگی دست مہر سے جو میرے لینے میں محصور ہے میرا دل لرزتا ہے کیوں کہ شبنم کو نوک خار سے لینا خلش دست رنگی سے خالی نہ ہوگا۔“

۱۸۔ لاف حشکیں فریب سادہ ولی

ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداور

والد نے اس شعر کی شرح اس طرح کی ہے ”ایسے دل گداز اسرار عاشقی کا میں راز دار ہوں کہ سامع ان کو سن کر اگر لاف مہر و قہر مارے، لاف زنی اس کی فریب ناوازی



سے ہوگی۔" یہ مطالب تمام مرہجہ شرحوں کے خلاف ہیں اور بظاہر اس شعر کے قرائن سے سامع کسی طرح مضمون کا سراغ نہیں پاتا۔

۱۹۔ آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

کون بیٹتا ہے قری زلف کے سر ہونے تک

اس شعر کے نیچے والد نے صرف سر ہونے کے معنی "رہا ہونے یعنی دراز ہونے تک" لکھے ہیں۔ مزید کسی قسم کی کوئی تشریح نہیں۔ یہ معنی مجھے کسی لالت یا شرح میں نظر نہیں آتے اور بظاہر کل نظر ہیں۔

۲۰۔ آزادئی نسیم مبارک کہ ہر طرف

ٹوٹے پڑے ہیں حلقہ دام ہوائے گل

اس شعر کی صورتی خصوصیات میں تو نسیم، گل اور ہوا کی رعایت کے علاوہ آزادئی اور حلقہ دام اور ٹوٹے پڑے ہیں کا تضاد بھی قابل توجہ ہے۔ اور میری رائے میں ٹوٹے پڑے ہیں بلور اکھار کثرت محاورہ استعمال ہوا ہے۔ سو مطلب اس شعر کا صرف اس قدر ہے کہ شے کھل گئی ہیں اور خوشبو آزاد ہو گئی ہے۔ نسیم کو یہ آزادئی مبارک ہو۔ اب ان مسئلہ مطالب سے قطع نظر والد نے اس شعر کے ضمن میں جو اشارہ دیا ہے وہ یہ ہے "ٹوٹے پڑے ہیں۔ فصل خزاں میں" جو موجود سیاق و سباق میں قابل فہم نہیں۔

۲۱۔ قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

اس شعر کے مطالب میں والد نے صرف اس قدر لکھا ہے "یعنی وہ لکھیں گے کہ مطلب خط معلوم نہ ہوا تو یوں کہ کون ہے۔" اس اشارے سے اس دور کا طرز فکر اور سادہ لوحی کا اظہار ہوتا ہے۔

۲۲۔ حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو

کہ چشم تک شاید کثرت نگارہ سے دا ہو

والد نے اس شعر کے نیچے یہ اشارہ دیا ہے۔ "خطاب بہ زابد جو خور و یوں کو دیکھ نہ

ہکے" اور ظاہر ہے کہ انھوں نے اس شعر کی وسعت کو بہت محدود کر دیا ہے۔

۲۳۔ طاعت میں تار ہے نہ سے واگتیں کی لاگ

دورخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

والہ نے اس شعر کے ضمن میں یہ لکھا ہے۔ "لاگ، خلاف، دورخ میں بہشت کو ڈال دو تاکہ سے اور اگتیں کی لاگ نہ رہے کیوں کہ سے آتش دیدہ ہے اور جوئے عمل جنت آتش دیدہ نہیں ہے۔ جب یہ بھی آتش دیدہ ہو جائے تو دونوں مساوی ہو جائیں گے۔" ظاہر یہ شرح مرہجہ مطالب و مسرہ معانی کے خلاف ہی نہیں عجیب بھی ہے لیکن اس میں ایک لفظ لاگ کے معنی درست معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے اردو کے جتنے لغت دیکھے بشمولیت شان الحق حقی کے تازہ ترین لغت فرہنگ مکتظ کے سب میں اس لفظ کے معنی عداوت، رنجش مخالفت ہی نظر آئے۔ لیکن حیرت ہے غالب نے یہاں یہ لفظ نسبت، تعلق اور لگاؤ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ جب کہ اس کے مسلک معنی میں خود ان ہی کا شعر ہے۔

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ

جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

اور اس شعر میں لاگ اور لگاؤ چوں کہ دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس لیے دونوں کے معنی کا فرق بھی ظاہر ہو گیا ہے۔

۲۴۔ اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقی ستم تو دیکھ

آئینہ تاکہ دیدہ فقیر سے نہ ہو

چند مستثنیات کے علاوہ اس شعر کا مطلب اکثر شارحین نے یہی لکھا ہے کہ وہ اس قدر ستم آئین ہے کہ اپنی صورت بھی دیدہ فقیر کے علاوہ کسی دوسرے آئینے میں نہیں دیکھتا۔ عام آدمی کے لیے یہ مضمون کوئی خاص چیز نہیں ہے بلکہ شاذ و نادر ہی کوئی شخص اس مضمون کو صحیح طور پر سمجھ پائے گا جب تک کہ اس کو یہ نہ معلوم ہو کہ مذہب کی آنکھ میں موت کے بعد آئینے کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تمام شارحین کی اس کی کو والہ

نے اس طرح پورا کر دیا ہے۔ ”جب تک چشم قرانی سے آئینہ نہ ہو اپنی صورت کو دیکھتا نہیں۔ لطف یہ کہ چشم مذہبوح میں ذائق کی صورت آکھنے کی مانند نقش پڑے ہوئی ہے۔“

۲۵۔ بچتے نہیں مواخذۃ روز حشر سے

قائل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

ہوں تو مرہبہ شرحوں میں اس شعر کے مطالب میں تمہوزا بہت فرق ہے لیکن والد نے تمام شرحوں کے خلاف بالکل ایک نیا راستہ اختیار کیا ہے۔ کہتے ہیں ”بچتے نہیں: ہم۔ تم گواہ ہو یعنی تم ایسی گواہی دو گے کہ قائل بیخ جائے گا اور محتول گرفتار ہو جائے گا۔“

۲۶۔ بیداد وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر

ہر چند مری جان کو تھا رہا لیوں سے

والد نے اس شعر کی تشریح اس طرح کی ہے۔ ”مہد وفا نے جو مستحق کے ساتھ تھا جان برب رسیدہ کے رہا کو لیوں کے ساتھ رہنے نہ دیا اور پاس مہد میں جان جاتی رہی۔“ والد کی تشریح میں پاس مہد وہ نیا عنصر ہے جو انھوں نے اس کے مطالب میں داخل کیا ہے جو کسی دوسرے شارح کے ہاں نہیں۔ سب نے جان جانے کا سبب بیداد بتایا ہے۔

۲۷۔ بس بھوم تا امید ی خاک میں مل جائے گی

یہ جو اک لذت ہماری سخی ہے حاصل میں ہے

والد نے اس شعر کے تحت صرف سخی ہے حاصل کے معنی لکھے ہیں اور وہ یہ ہیں: ”وہ سخی جو حصول مدعا کی توقع پر کی جاتی ہے۔“ ع تا مقدس مگر جیسا ہے اسے کیا کہیے۔

۲۸۔ تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے

حوران غلہ میں تری صورت اگر ملے

سلم شدہ مطالب کے خلاف والد نے اس کے یہ مطالب بیان کیے ہیں۔ ”شاید تیری صورت حوران جنت میں ملے اور اس ملنے سے مزہ نظر باری کا حاصل ہو مگر ہم تجھے نہ دیکھیں تو تسکین کا کیا ماتم نہ کریں گے۔“

۲۹۔ جتنی ہے نہ کچھ عزم ہے غالب

آثر تو کیا ہے اے نہیں ہے

اس کے مطالب میں شاعرین میں چھاں اختلاف نہیں۔ والد نے اس شعر کا کوئی تفصیلی اشارہ بھی نہیں دیا صرف لفظ "اے" کے معنی "اگر" لکھے ہیں جو مجھے اردو فارسی مرئی کسی وقت میں نہیں ملے۔

۳۰۔ بہت دنوں میں تغافل نے حیرے پیدا کی

وہ اک نگہ کر بظاہر نگاہ سے کم ہے

اس شعر کے معنی میں والد نے بہت دنوں کے معنی بہت دنوں کی مشق کے لیے ہیں جو دوسری شخصوں پر اضافہ معلوم ہوتا ہے۔

۳۱۔ کبھی تو اس دل شوریہ کی بھی داد ملے

کہ ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہے

اکثر شاعرین نے صرف عجب پر آرام کرنے کی حسرت کا بیان کیا ہے لیکن والد نے اس پر ہم بالین وہم بہتری کا ان الفاظ میں اضافہ کیا ہے۔ "کبھی تو اس دیوانے کو اپنا ہم بالین وہم بہتر کچھ کہ ایک مدت سے حسرت پرست اس کا ہے۔"

۳۲۔ وفا حقائق و دعویٰ عشق ہے بنیاد

جنون ساختہ و فصل گل قیامت ہے

اکثر شاعرین اس شعر پر متفق ہیں لیکن والد نے ایک عجیب تخریج کی ہے جو خاصی انوکھی اور عجیب ہے۔ کہتے ہیں "وفا مذ نظر و ردو عاشق صادق کے اور ہاں وہ اس کی عاشقی کا دعویٰ ہے بنیاد۔ کیوں کہ وفائے عاشق صادق پاک دامن مانع ہوا و ہوس ہے اور جنون عشق عاشق بوالہوس کا ساختہ ہے۔ فصل گل میں یا بہار حسن معشوقی میں جلال کہ فصل مذکور میں جنون ساختہ محال عادی ہے۔ پس یہ عجیب معاملہ ہے۔ یہ شعر مرزا صاحب کے پایہ بلاغت سے گرے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ بالکل ان میں تعقید معنوی ہے۔" بھلا سوچے اب کسے رہنا کرے کوئی۔

۳۳۔ سوزشِ باطن کے ہیں احباب مگر دردِ یاق

دل محیطِ گریہ و لب آشتائے خند ہے

اس شعر کا مطلب صرف یہ ہے کہ لوگ میری سوزشِ باطن کو نہیں مانتے۔ حالاں کہ صورتِ حال یہ ہے کہ میرے لبوں پر تو ہنسی ہے لیکن میرا دل دویائے غم ہے۔ اب والد کی شرح اور صحیح کلام غالب بھی ملاحظہ ہو۔ "سوزشِ سبب گدازِ دل اور مہلختہ وہ گدازِ موجد محیط ہے سائل ہوا۔ اس کو شورشِ پڑھیں تو ابلغ ہو گا یعنی فقط شورشِ بدوشین مجھ سے معنی دیا لگی جس میں ایہامِ شور و دیا کا بھی ہے۔ چاہیے تا دلچ انوں کی دونوں حالت پر جو مصدرِ گریہ و خندہ ہوتے ہیں دلالت کرے خافہم۔"

۳۴۔ عالمِ غبارِ وحشتِ بختوں ہے سرِ سر

کب تک خیالِ طرۂ لعلی کرے کوئی

اس شعر کی تفسیر پر بھی شارحین متفق ہیں لیکن والد نے یہاں بھی ایک نئی اور مختلف بات کہی ہے۔ کہتے ہیں "عالمِ تیرہ و تار کو باہتیارِ سیاحی کے طرۂ لعلی یعنی سامانِ زینت ہم خیال کرتے ہیں حالاں کہ عالمِ مذکور غبارِ وحشتِ بختوں یعنی گردِ بیابانِ وحشت ہے۔"

۳۵۔ چالِ جھسی کزی کماں کا تیر

دل میں ایسے کی جا کرے کوئی

والد اس شعر کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں "جس کی چال ایسی سخت و سجد ہو کی تو دل اس کا کیا ہو گا۔"

۳۶۔ دعا عجب تماشا ہے گلستِ دل ہے

آئینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ اکثر شارح اس شعر کے مطالب پر متفق ہیں لیکن والد کا انداز یہاں بھی مختلف ہے۔ کہتے ہیں "میں خواہاں اپنی گلستِ دل کے دیکھنے کا ہوں۔ آئینہ خانہ میں جا کر صورت پرستی کیا کروں۔ مجھے آئینہ خانے میں بھلا کوئی کیا لے

جائے گا۔ دوسرا پہلو محبوب اپنے ساتھ مجھے آئینہ خانے میں لیے جاتا ہے۔ مدعا اس کا یہ ہے کہ میری شکست دل کو وہاں قماش کرے۔ پھر رفیق اس بات کے کہ عاشق کے دل کی طرف اس کی توجہ نہ ہوئی آئینہ خانہ کی طرف ہوئی۔“

شعرا سلامیہ الرحمٰن ہیں۔ ان کا وجدان ایک آسانی و سادگی چیز ہے جب کہ ان کی زبان ارضی۔ چنانچہ شاعری ارضی حقیقت اور سادگی تخیل کا اتصال ہے۔ اور ظاہر ہے یہ کس قدر مشکل کام ہے۔ الفاظ مسلسلہ معانی کے ذیلے و علایے صاف سترے غنڈے سخت فولادی سانچے ہیں اور اس لیے ایک ارضی حقیقت۔ شاعر کا تخیل اس کا فکر اس کی روح کے گداز کا سحر چتر ہے، اس کے وجدان کا لاوا۔ سو یہ لاوا کبھی ان سانچوں کے مختلف المیہ وجود کو نظر میں رکھ کر نہیں بہتا۔ یہ تو جب بہنا شروع کرتا ہے تو الفاظ کے یہ ارضی سانچے اس کے نیچے دب جاتے ہیں۔ اور پھر یہ ہوتا ہے کہ ہمارے شارمین و ناقدین لاوے کے نیچے سے ان کے دبے سانچوں کو ایک ایک کر کے نکالتے ہیں۔ جہاز پونچھ کر صاف کر کے اپنی دانست کے مطابق ان کی درجہ بندی کر کے کسی پاکستان شناس کی طرح ان کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ وجدان کے اس اچلتے سیلاب میں بہت سے سانچے ٹوٹ جاتے ہیں۔ بہت سوں کی صورت بگڑ جاتی ہے، بہت سے سانچے ایک دوسرے میں جڑ جاتے ہیں اور اس طرح عام قاری ہی کے لیے نہیں نقادان فن کے لیے بھی مشکل ہوتی ہے کہ وہ شاعر کے اس گداز روح کو ارضی زبان میں سمجھیں اور سمجھائیں کہ یہ لاوا ان سانچوں کے مسلسلہ خطوط کی ساری حدود توڑتا نظر آتا ہے۔ لیکن اس بنیادی قباحت سے متاثر ہوتے ہوئے بھی شارمین و مفسرین ان سانچوں سے الفاظ نکالتے اور ان کے معنوی وجود کو متعین کرتے ہیں۔ عام نقاد کو جو مسلسلہ معانی کے نقوش سے مغرب نہیں ہوتا اس حدود شکنی کو زبان و بیان کے خلاف سمجھتا اور اکثر اس شاعری کو بے معنی خیال کرتا ہے۔ لیکن کوئی نقاد فن جو خود بھی وجدان کی اسی Frequency پر ہو کہ جس پر شاعر بہ وقت تخیلی قہا تو اس کو اس شاعری میں مطالب و معانی کے جہان نظر آتے ہیں۔ غالب کی اکثر شاعری وہ

قدیم دھینے ہے جو اس کے اپنے وجدان کے لاوے میں لہتی ہوئی ہے۔ ہماری حقیقت پسندی (دنیاوی انسانی ہونے کے ناتازے) بعد زمانی اور بے بصیرتی نے رفتہ رفتہ اس پر معنی کی اور جہیں چڑھا دی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ تا حال اس شہر معنی کی بیرونی حدود بھی متعین نہیں ہوئیں۔ نہ جانے وہ کون صاحب بصیرت ہو گا اور کب جو اس کے کہاں خانہ معنی میں پہنچ کر اس کے شیش محل کے درود پوار کے نقش و نگار اچال سکے گا۔

## تقہ کا نام مرہیہ غالب

وئی سے چالیس پینتالیس میل شمال کی جانب ایک قصبہ سکندر آباد (ضلع بلند شہر) ہے جسے سکندر لودھی (۱۳۸۹ء تا ۱۵۱۷ء) نے بسایا تھا۔ اسی کے زمانے میں ایک بھٹاگر کانسٹہ نام طوابع دیپ چند، فیروز آباد، مضائقہ آگرہ سے نقل مکانی کر کے یہاں بس گئے۔ یہ لوگ آج بھی فیروز آبادی کہلاتے ہیں۔ اس خاندان کو بادشاہ کی طرف سے پانچ سو چالیس (۵۴۰) ٹککے پلتے معافی اور موروثی منصب قانون کوئی عطا ہوا تھا۔

ان خواجہ دیپ چند ہی کی اولاد میں ایک صاحب موتی لال ہوئے جن کے آٹھ بیٹے تھے جس سبب سے وہ بعد میں ”آٹھ گھرے“ کہلائے۔ غشی ہر کو پال ان ہی موتی لال کے بیٹے تھے۔ یہ ۱۲۱۳ھ (۱۸۰۰-۱۷۹۹ء) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ قاری کا شوق شروع سے تھا۔ انگریزی محکمہ ہندوستان میں مذکور قانون گو رہے۔ ۱۸۵۰ء میں تھوڑے عرصے کے لیے ریاست جے پور میں بھی ملازمت کا تعلق ہو گیا تھا لیکن جلد ہی مستعفی ہو گئے۔ ۲ ستمبر ۱۸۹۹ء (۱۵ رمضان ۱۲۹۹ھ) کو سکندر آباد ہی میں وفات پائی۔ ہداری کشن فروغ نے تاریخ وفات کہی:

سن (کذا) عیسوی کفتم آخر فروغ

چہ سوے جٹاں، زیر جہاں، تقہ رفت

(۱۸۷۹ء)



مولوی مستاز علی تھانوی نے سہ جہری میں تاریخ کہی:

سالِ نقوش با دلِ زارہ از غرور

من شنیدم "بے سرو پا شد خن"

حسین نعلی خاں نے اپنے تذکرے "نثرِ مشق" میں لکھا ہے کہ نور العین واقف تھانوی کے دیوان کے مطالعے نے ان کے دل میں شعر گوئی کا شوق پیدا کیا۔ چوں کہ ذکاوت و استعداد سے وافر حصہ ملا تھا، اس لیے تھوڑی سی مشق سے بہت جلد ترقی کر گئے۔ نثرِ مشق میں جو احتسابِ کلام ہے، اس میں نقوشِ راتمی ہے لیکن اس کے کافی عرصے بعد جب انھوں نے غالب کی شاعری اختیار کی تو غالب نے نقوش بدل کر تفتہ اور مرزا کا خطاب دے کر ان کو مرزا تفتہ کر دیا۔ غالب کے محبوب شاعروں میں تھے، چنانچہ انھوں نے ان کی تہذیب و حسین میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔ تفتہ بھی ساری زندگی غالب ہی کا دم بھرتے رہے اور ہمیشہ ان کو اپنا استاد رہنما اور مرشد مانا۔

تفتہ نے ساری زندگی فارسی میں بھرکی۔ مالک رام کے بقول چار اور ڈاکڑ اکبر حیدری کے بقول پانچ ضخیم دیوان یادگار چھوڑے، اس کے علاوہ اپنے چھوٹے بیٹے فقیر سنگھ کی موت پر 'تضمینِ گلستان' بھی لکھی جس کو غالب کے چچئی باقر علی خاں کے نام متون کیا گیا، پھر سعدی کی 'بوستان' کے انتخاب میں اپنے عزیز دوست ظہور علی کی دل داری کے لیے طویل منظوم لکھی جس کا نام غالب کی فرمائش پر 'سلطان' رکھا گیا۔ ان کی یہ ساری تصنیفات فارسی میں ہیں۔ غالب کے شاگرد رشید ہونے کے ناتے، اور پھر اپنی مستقل سعی و کاوش اور فطری استعداد کے سبب، ہندوستان کے فارسی گو یوں میں ان کا مرتبہ صحیح طور پر آج تک متعین نہ ہو سکا۔ اس کی پہلی اور بڑی وجہ تو یہ ہے کہ انگریزی حکومت کے قائم ہوتے ہی فارسی کے رائج الوقت نہ رہی، دوسرے: باوجود اس قدر کثیر ادبی سرمایے یادگار چھوڑ

جانے کے، ان کا کلام دستیاب نہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کے بقول فی الوقت ان کا صرف دو جلد دوم (مطبوعہ ۱۸۵۷ء) کا ممدہ اور مکمل نسخہ کتب خانہ شیلی نونانی (نمودہ)، بھکتو میں موجود ہے۔

اردو کی طرف انھوں نے بھی توجہ نہ کی، البتہ مختلف تذکروں میں صرف دو اشعار کا ایک قطعہ ملتا ہے جو انھوں نے غالب کی موت پر کہا تھا۔ اس قطعے سے ایک بار پھر اس بے مثال قلبی بیگانگی کا پتا چلتا ہے جو ان کے اور غالب کے درمیان تھی اور میرے خیال میں اردو کا یہ معمولی قطعہ اس شخص کی یاد میں ایک حقیر تذرانہ ہے جو خود اردو کا عظیم شاعر تھا۔ وہ قطعہ یہ ہے:

غالب وہ شخص تھا ہر دہا جس کے فیض سے ہم سے ہزار بیچ بھلاں نام در ہوئے  
فیض و کمال و صدق و صفا اور حسن و عشق چھ لفظ اس کے مرنے سے بے پایاں ہوئے  
مرزا غالب اور تقیہ کے تعلق خاطر کو مالک رام نے تقیہ اور غالب (از ڈاکٹر  
محمد ضیاء الدین انصاری، مطبوعہ غالب اکیڈمی، جی دہلی، ۱۹۷۳ء) کے دیباچے میں بڑی  
اچھی طرح واضح کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

”لیکن غالب کے تقیہ سے تعلقات کا عالم ہی دوسرا ہے۔ ان میں  
قرب و بیگانگی کا اندازہ اُن خطوط سے لگایا جاسکتا ہے جو غالب  
نے تقیہ کو لکھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی خاندان کے  
فرد ہیں۔ ایک دوسرے کے معاملات میں شریک، فنی مسائل میں  
مشورہ، لیکن دین، آپسی دکھ درد میں شریک۔ اس میں کوئی شک  
نہیں کہ ایک مہر مہدی مجروح کے علاوہ کوئی دوسرا شاگرد استاد کے  
اتنا قریب نہ تھا، جتنا تقیہ۔“

اگرچہ مرزا غالب عمر میں مرزا تقی سے دو سال چھوٹے تھے لیکن استاد کی رعایت سے تقی نے ہمیشہ حفظ مراتب رکھا اور وضع و شریف شاگردوں کی طرح اس مقدس اور محترم رشتے کو اس کے مرتبے سے نہ گرنے دیا۔ دونوں کی قلبی یکاگرت اس پائے کی تھی کہ غالب ان کو ایک دوست صادق الولا اور کبھی اپنی اولاد اور کبھی ان کے اشعار کو اپنے معنوی پوتے کہتے تھے۔ مرزا نے ایک سو چوبیس اردو کے اور انیس فارسی کے خطوط میں جو القاب تقی کے لیے لکھے ہیں، وہ ان کی قلبی یکاگرت کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان خطوط میں ہمیں بھائی، مہاراج، بر خوردار، جان من و جانان من، نور نظر، لختِ بکر، کاشانہ دل کے ماو دو ہفتہ جیسے القاب نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے وسیع حلقہٴ احباب میں شاید ہی کوئی دوسرا شخص ہو جس کو غالب نے اتنی تعداد میں خط لکھے ہوں، پھر اس قلبی یکاگرت کا یہ حال تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے ہمہ وقت قرب چاہتے تھے۔ غالب کے بہت سے ایسے خط ہیں جن میں چند دن تقی کی خبر نہ ملنے پر غالب نے انتہائی تشویش میں بے در پے کئی خط لکھے ہیں اور بالآخر بڑی تاکید کی ہے کہ:

”سنو صاحب! اپنے پر لازم کرو، ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھا۔“

اگر کام پڑا تو دو تین خط، ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے

میں ایک بار بھیج دی۔“

تقی اور غالب کے اس قلبی تعلق اور قربت باہمی کی طواہش کا اظہار اس وقت خاص طور پر اور بھی شدت سے ہوا جب غالب ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے اور دو ماہ وہاں رہے، اور تقی، غالب کے لیے ترچہ رہے۔ اس وقت تقی نے تجویز پیش کی کہ مجھے بھی رام پور ہی بلا لیجیے۔ اصولاً غالب اس تجویز پر راضی ہو گئے، چنانچہ اپنے خط میں لکھتے ہیں:

”منظور مجھ کو یہ ہے کہ اگر یہاں رہتا ہوا تو فوراً تم کو بلا لوں گا۔“

جوں زندگی کے باقی ہیں، وہ ہا ہم بسر ہو جائیں گے۔“  
لیکن معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے اس جواب سے نقۃ مطمئن نہیں ہوئے اور یہ کہے  
کہ غالب انھیں رام پور بلانا نہیں چاہتے۔ اس شبہ کا اظہار انھوں نے یقیناً اپنے خط  
میں کیا ہوگا جس کے جواب میں غالب نے انھیں ان الفاظ میں سمجھایا:

”آ خر لڑکے ہو، بات کو نہ سمجھے۔ میں، اور نقۃ کو اپنے پاس ہونا  
نہایت نہ مانوں؟ میں نے یہ لکھا تھا کہ یہ شرط اقامت بلالوں کا،  
اور پھر لکھتا ہوں کہ اگر اقامت یہاں کی ٹھہری تو بے قصار سے نہ  
رہوں گا، نہ رہوں گا، نہ ہار نہ رہوں گا۔“

شاگرد و استاد کا یہ قلبی تعلق، کہ جو شاگرد و استاد کے رشتے سے بلا کہ مرید و مرشد  
کے درجے پر پہنچ گیا تھا، چالیس سال تک قائم رہا۔ نقۃ نے اپنے زیرِ نظر مرعے میں یہی  
تایا ہے:

د ر م ن و ا و ہ یاریِ حتم  
تا چہل سال ماند صحبت ہ

’ذکر غالب‘ میں مالک رام نے لکھا ہے کہ غالب کی وفات پر متعدد حضرات نے  
مرعے اور تارینیں لکھیں، ان میں سے جاتی، بھروج اور سالک کے مرعے مشہور ہیں۔  
حیرت اس امر پر ہے کہ جب نقۃ کے غالب سے تعلقات عالم آکار تھے تو مالک رام  
جیسے دقیقِ نظر سوانح نگار سے نقۃ کا مرثیہ صرف توجہ کس طرح ہو گیا؟ بہت ممکن ہے کہ اس  
کی وجہ وہی ہو جو ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنے مقالے ”مرزا نقۃ اور آؤدھ اخبار“ مشمولہ:  
نوادیرِ غالب (مطبوعہ ادارۃ یادگار غالب، کراچی) میں بیان کی ہے۔ فاضل مقالہ نگار  
”آؤدھ اخبار ۲۶۔ اکتوبر ۱۸۶۹ء، ص ۱۰۳۲ تا ۱۰۳۹“ کی سرخی دے کر لکھتے ہیں:

”اخبار کا یہ شمار نہایت مفید اور غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں تقیہ نے واقعی غالب کی شاگردی کا حق ادا کر دیا ہے۔ انھوں نے غالب کی وفات پر چند روزہ کا ایک طویل ترجیع بند لکھا جس میں غالب کی سیرت کے علاوہ ان کے کلام کے محاسن بھی بیان کیے ہیں۔ یہ معرکہ آرا مرثیہ صرف آدھ اخبار تک ہی محدود رہا اور تقیہ کے کسی دوج ان میں دست یاب نہیں ہے۔ تقیہ کا کوئی دوج ان اب نہیں مل رہا۔ ذیل میں پورا ترجیع بند درج کیا جاتا ہے کہ محفوظ رو سکے۔“

حقائق میرے لیے بھی تقیہ کے اس مختصر تعارف کے ساتھ اس طویل اور واقعی معرکہ آرا مرثیہ کے ترجمہ کرنے اور اصل فارسی متن کے ساتھ قارئین کو پیش کرنے کا یہی محرک تھا کہ یہ نایاب و ندر اثر مرثیہ غالب دوستوں تک پہنچ کر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے۔ اتفاق ایسا ہے کہ حاتی کا ہی نہیں، مجروح اور سالک کے مرثیے بھی میری دست رس میں ہیں۔ میں نے ان کو بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھا اور خاطر خواہ حکا اٹھایا ہے لیکن تقیہ کے مرثیہ کے ضمن میں ڈاکٹر اکبر حیدری سے سو فیصد متفق ہونے کے ساتھ ساتھ میں یہ کہنے کی جسارت بھی کرتا ہوں کہ یہ مرثیہ غالب اور تقیہ کے وسیع و عریض و عسق قلبی و روحانی تعلق کا ہمہ جہت ترجمان ہونے کے باعث یقیناً چیز سے وگر ہے۔ لیجیے! مرثیہ پیش خدمت ہے:

چیں! چہ سوال ما محرم شد  
اسد اللہ خاں، ز عالم شد

ترجمہ: ارے! ہمارا سوال (تو) محرم ہو گیا  
(کہ) اسد اللہ خاں کا انتقال ہو گیا

نہ شہی کاش! یک دو قرن وگر  
راحم رنج و شادیم غم شد

ترجمہ: ایک دو صدی کاش تم اور رہتے، یہ نہ ہو سکا  
میرا شکہ چین، رنج و غم میں داخل گیا

آہ از سینہ ام بیا بے خاست  
اشک از دیدہ ام و ما دم شد

ترجمہ: مرے سینے سے آہ مسلسل نکلی  
(کہ) میری آنکھوں سے آنسو زہر و شہ سے نکل ہو گئے

حال او یوں، آں کہ نیکو گشت  
کار ما یوں، آں کہ برہم شد

ترجمہ: اُس کا (اپنا) احوال (تو) درست ہو گیا  
(ہر) ہمارا حال تباہ ہو گیا

من چہ علقتم کہ عالم نہ ملت  
سہ کتاب آفتاب شبنم شد

ترجمہ: میں کیا بتاؤں کہ مری تقدیر ہی پلٹ گئی  
(میرا) چاند نازک کپڑا اور آفتاب (گویا) شبنم ہو گیا

یک خلف بود آں کہ نام آدم  
ہم چو غالب چہ نسل آدم شد

ترجمہ: حضرت آدم کا ایک ہی (تو) نام آدم اور چنانچہ  
خلف غالب تھا جو اس کی نسل میں پیدا ہوا

گفتنی نیست انجائے غم  
یعنی ایں بس کہ پشتِ من غم شد

ترجمہ: اس کا غم قابل بیان نہیں  
اتنا (کہنا) کافی ہے کہ (اس غم نے) میری کمر جھکا دی

آں سخن در، دے کہ شد بے جاں  
جاں ز جسم سخن، ہاں دم شد

ترجمہ: اس شاعر کے جسم سے جان کیا نکلی  
(گویا) بہن شاعری بے جان ہو گیا

چوں نہ خواہد رسید از من و دل  
نام آرام ما، اگر دم شد

ترجمہ: ہم سے ہمارا دل کیوں نہ فرار کرے گا  
کہ جب ہمارے آرام کا نام ہی "نوم" پڑ گیا

یادم آمد چو سیر دریا بش  
اشک جاری ز چشم پر خم شد

ترجمہ: مجھے اس کی دریا کی سیر جو یاد آئی  
(تو بے اختیار) میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے

آں قدر ہا کہ درد دل افروز  
آں قدر تا دم این مریم شد

۱۔ سخن میں افروز ہے جب کہ افروختہ درست معلوم ہوتا ہے۔ ترجمہ افروز سے کیا گیا ہے۔



ترجمہ: دردِ دل نے اس کی منزلت اس حد تک بڑھا دی  
کہ ایک وقت اس کو سیٹھا بنا دیا

جاں بدردِ نوی مشرقِ گشت  
دل پہ داغِ کہنِ مکرم شد

ترجمہ: جاں کو مجھے درد کا شرف نصیب ہوا  
(اور) دل کو پرانے داغ کا افتخار ملا

مرگِ نادرِ بنورِ جاں گوید (کذا)  
ناتواں نہ یِ توانم شد

ترجمہ: (متن واضح نہیں)

میں کہ ناتواں ہوں توانا نہیں بن سکتا

از پدر و پسر چہ ذکر و چہ وقت  
دل نہ سہراب و غم نہ رستم شد

ترجمہ: اس وقت (بھلا) باپ اور بیٹے کا کیا ذکر  
(کہ) نہ ہی دل سہراب بن سکا اور نہ غم رستم ہوا

بے چکے او زیم چہ ایں دو بلا  
دہر کڑوم سپر ارقم شد

ترجمہ: اب اس ایک شخص کے بغیر میں (کیلا) جی رہا ہوں اور یہ بلا میں  
زمانہ بچھو اور آسان (میرے لیے) سیاہ سانپ بن گیا ہے

آقام رسید بر لب بام  
لیکن اندہ نہ ذرۂ کم شد

ترجمہ: میرا آقام (زندگی) لب بام تک پہنچ گیا  
لیکن میرا غم ذرہ برابر بھی کم نہ ہوا

باورم نیست، گویم از جبریل  
کہ پراگندہ دل فراہم شد

ترجمہ: (اگرچہ) مجھے یقین نہیں آتا (کیوں نہ) جبریل سے پوچھوں  
کہ کیا (غالب کا) پراگندہ دل مجتمع ہو گیا۔

یا در شخص کو بیہ ایں کہ مرا  
درد درماں و زخم مرہم شد

۱۔ اس شعر کا ایک اور مضمون بھی ہو سکتا ہے۔ ”مجھے یقین تو نہیں آتا۔ (کیوں نہ) جبریل ہی سے پوچھوں۔ کیا اب لیکن  
غالب کو نہ کر معجزہ کے دل کو بھی آگیا۔ اگرچہ قرآن اسی مضمون کے ہی لیکن میں عوام اس کو ٹیٹ نوٹ میں لکھ رہا ہوں۔

ترجمہ: یا (ہے کہ) کوئی دوسرا شخص مجھے یہ بتائے  
کہ (میرا) درد (میری) دوا اور دلم (میرا) مرہم ہو گیا

ہر کچے راستہ میں غنّ برب  
غیرِ باغِ الم کے حرم شد

ترجمہ: ہر شخص کی زبان پر یہ بات ہے  
(کہ غالب کی موت سے) سوائے باغِ الم کے کس کو طراوت ملی

ہر کہ از صبرِ لاف زد میں جا  
عیشِ ادبِ باطلِ ملوم شد

ترجمہ: ہر وہ شخص جس نے اس موقع پر صبر کی شنی ماری  
(وہ) عقل مندوں کے سامنے لائقِ الزام ٹھہرا

تاجِ من داغ و تختِ من خاک است  
تا جمن ملکِ غم مسلم شد

ترجمہ: (اب) داغ میرا تاج اور خاک میرا تخت ہے  
(اور) جتنا تک سارا علاقہ غم کے زیرِ نگین ہے

توپ گل آمدی و تاملت ام (کذا)  
ہمہ دور دور خیر مقدم شد (کذا)

ترجمہ: (مستن واضح نہیں)

داشت اعزاء ہاے یوکلوس  
کز ز اسرار او چہ محرم شد

ترجمہ: گونا گوں اعزاء رکھتا تھا  
ہر وہ شخص کہ اس کے اسرار سے واقف تھا

گاہ آئینہ گاہ جام گزشت  
گر سکندر شد د گے جم شد

ترجمہ: کبھی آئینہ اور کبھی جام ہاتھ میں لیتا  
(وہ) کبھی سکندر اور کبھی جیشید بن جانا تھا

ساکلاں را چہ ایں نہ نقتہ بہ لب  
او نہ شد از زمانہ حاتم شد

ترجمہ: سانکوں کی زبان پر اب صرف یہ صدا ہے  
قالب نہیں بلکہ ماتم وقت سر مینے

بل من و ہو چمن دعاگو را  
ناظر آلفیہ طبع برہم . شد

ترجمہ: بلکہ (اس کی موت سے) مجھ اور اس جیسے دعاگوؤں کی  
طبیعت افسردہ اور دل پریشان ہو گیا

شدہ آغوش چشم . خوں شدہ دل  
نکند کوئی پناہ دم دم شد

ترجمہ: دل خوں شدہ، آغوش چشم بن گیا ہے  
(جس طرح) کوئی پیاسا چاہ دم دم میں گر پڑے

ورچہ پدسی چہ شد چرا ایں نوع  
سود عالم تمام ماتم شد

ترجمہ: اور اگر یہ پچھو کہ کیا ہوا، (بھلا) یہ حالت کیوں ہے  
(کہ) دنیا کی شادمانی، ماتم میں بدل گئی

فخرِ مرئی و رشتہِ غالبِ مرد  
اسد اللہ خاں غالبِ مرد

ترجمہ: (قرابت یہ ہے کہ) فخرِ مرئی و رشتہِ غالبِ (آملی)  
اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہو گیا

۲

اسد اللہ خاں نہ تھا رفت  
بہرہش جانِ ما، دلِ ما رفت

ترجمہ: اسد اللہ خاں (اس دنیا سے) اکیلا نہیں گیا  
اس کے ساتھ ہماری جان اور ہمارا دل (بھی چلے گئے)

خننِ افسردہ دلِ خننِ دورِ مُرد  
معنی آزرده معنی آرا رفت

ترجمہ: خننِ دورِ مرا (قر) خننِ آزرده ہو گیا  
معنی کو زب و زحمت دینے والا مرا (قر) معنی افسردہ ہو گئے

رفتِ آں حالتے پہ من کہ پھر  
تا شنیدم کہ او ز دنیا رفت

ترجمہ: میری ایسی حالت ہو گئی کہ قافلہ جہاں نہیں  
جب میں نے یہ سنا کہ وہ دنیا سے چلا گیا

انک پند شور از ثری گمذشت  
آہ پندور تا ثریا رفت

ترجمہ: پند شور آنسو زمین کی تھاہ تک پہنچ گئے  
(اور) پند زور آہ ثریا تک پہنچ گئی

گرچہ آو رفت از جہاں آما  
یاد آو از دلم نہ اصلا رفت

ترجمہ: اگرچہ وہ اس دنیا سے چلا گیا  
(لیکن) اس کی یاد میرے دل سے ہرگز نہ گئی

فصل دادند بر کہش پس مرگ  
دیدي از دیدہ با چہ دریا رفت

ترجمہ: مرنے پہ جب اس کو فصل دیا گیا  
(تو) تو نے دیکھا لوگوں کی آنکھوں سے کیسے دریا بہ گئے

رفت روحش بہ جنت المادنی  
ایں کہ گوید کہ او ز مادی رفت

ترجمہ: اس کی روح (بھی) جنت المادنی چلی گئی  
یہ جو کوئی کہے کہ وہ اپنے گھر سے چلا گیا

نوری ریخت از جنازہ او  
عالیٰ از پے قاشا رفت

ترجمہ: اس کے جنازے سے ایک (ایسا) نور برس رہا تھا  
(کہ) لوگ اس کے قاشے کے لیے گئے

من چو بنستم از و نشان جبرئ  
گفت چو من بہرش اعلیٰ رفت

ترجمہ: میں اس کو سناش کر رہا تھا (تو) جبرئ نے  
کہا کہ وہ تو میری طرح عرش معلیٰ پر پہنچ گیا

دو دے مرا دوا او یو  
چوں نہ میرم کنوں میجا رفت



ترجمہ: میرے قلموں کی دوا تو وہی تھا  
اب کہ مسیحا ہی جا چکا ہے (تو) میں کیوں نہ مر جاؤں

و ز غمش رفتی ست جاں ز تم  
مگر نہ امروز رفت، فردا رفت

ترجمہ: اس کے غم میں میرے جان جاتی ہی جاتی ہے  
اگر آج نہیں گئی تو کل گئی

گفت از صبر من کہ بحث نکاش  
پہ مقامے کہ ذکر عطا رفت

ترجمہ: میرے صبر کا چٹا جس نے بھی لگایا  
(تو) اس جگہ سے کہ جہاں تک ذکر عطا گیا

وہ چہ ایں آدم چہ آں رفت  
حسرت آمد پہ دل تنہا رفت

ترجمہ: ہائے! میرا آنا اور جانا تو اس طرح ہے  
گویا دل سے تنہا گئی اور حسرت آگئی

از دور یاس کاں نہ دائم گشت  
رہنم کو کہ طاقت از پا رفت

ترجمہ: مایوسی کے دور سے کیوں کر انھوں سمجھ میں نہیں آتا  
(اور) پاؤں تو کہاں کہ پاؤں سے طاقت نکل گئی ہے

تا چہ آید بجان من فردا  
آں کہ امروز بود یکسا رفت

ترجمہ: میری جان پر کل (نہانے) کیا مصیبت آئے  
آج کے دن (تو غالب) تھا ہی چلا گیا

انچہ بر من نہ از وفات کے  
نیش ازیں رفتہ بود حالا رفت

ترجمہ: اس سے بیش تر کسی کی موت پر  
مجھ پر وہ کچھ نہیں چتا جو اب بیت گیا

چوں نہ قرباں روم جنابا را  
برمن و جان من جنابا رفت

ترجمہ: جفاؤں کے کیوں نہ قربان جاؤں  
کہ مجھ پر اور میری جان پر جفا نہیں آ پڑیں

انچہ می خواہم نہ گشت نصیب  
انچہ می داشتم بہ یغما رفت

ترجمہ: میں جو چاہتا تھا مجھے نصیب نہ ہوا  
(اور) جو میرے پاس تھا وہ اُٹ گیا

بخش ازو چوں مرا نہ کرد ہلاک  
و ز من و مرگ ماجرا بہ رفت

ترجمہ: (غالب) سے پہلے مجھے ہلاک کیوں نہ کیا  
(اس بات پر) موت کے ساتھ میری بڑی وارداتیں ہوئیں

بود ہر چند کہ وہ پا بہ جا  
نالہ ام چوں شنید از جا رفت

ترجمہ: (موت) ہر چند کہ اپنی (کرتی پر) پہاڑ کی طرح ڈٹی رہی  
لیکن میرے نالے سن کر بل گئی

میر شہ اضطراب در غمِ او  
یا نہ کی رفت دل نہ خود یا رفت

ترجمہ: اس کے غم میں اضطراب مضطرب پڑ گیا  
یا تو دل ہوش و حواس میں تھا یا (یک دم) بد حواس ہو گیا

رفت تقدیر و کلفت کن تا چار  
ہم تا رفتی بمن تا رفت

ترجمہ: میری تقدیر پٹ گئی تو مجھ بے بس نے کہا:  
یہ ساری ناشدنی میرے ساتھ ہی ہوتی تھی

نقشہ ہے او چو خلقت دیوانہ  
چہ قدر رہا بہ کوہ و صحرا رفت

ترجمہ: غالب کے نہ ہونے سے نقشہ دیوانہ ہو گیا  
اور پھر کیا کیا کوہ و صحرا میں پھرتا رہا

ہاں چوں خواند پیش خویش مرگ  
چہ گویم چہ ہے محال رفت

ترجمہ: اور پھر جب مرگ نے غالب کو اپنے سامنے بلایا  
تو کیا بتاؤں وہ کیا ہے دھڑک چلا گیا

چوں چہ دہلی روانہ کرم خط  
خبر آمد حضور والا رفت

ترجمہ: میں نے دہلی خط بھیجا  
تو معلوم ہوا کہ حضور والا تو رخصت ہو چکے ہیں  
یا۔۔۔ تو معلوم ہوا کہ وہ اللہ کے حضور پہنچ گئے

\*\*\*

ہو تا کہ با حافظ  
اندریں روز با تا رفت

ترجمہ: ایک شخص کہ جو حافظ کی نظیر تھا  
ان دنوں وہی رخصت ہو گیا

کلمہ اکٹوں خوش باید ماند  
چوں حکایت ز جام و مینا رفت

ترجمہ: جام و مینا کی چب بات ہوئی  
(تو) میں نے کہا ان دنوں خاموش رہتا چاہیے

لکس خود کشم و ہر دور  
ہر زبان ہر عزم نہ حاشا رشت

ترجمہ: میں سانس تو (بدستور) لیتا ہوں لیکن (اس) منصف کے لیے  
میری زبان پر کبھی شکوہ نہ آیا

دشت از خوشتم دلم در درد  
گاہ ای جا و گاہ آں جا رفت

ترجمہ: دشت نے مجھے حواس باختہ کر دیا  
(میرا دل) کبھی ادھر جاتا، کبھی ادھر جاتا

من نہ کلقم جز ایں بہ جلہ شعر  
تاز عرقی و طالب ایما رفت

ترجمہ: میں نے کسی جلہ شعر میں سوائے اس کے  
کہ تاز عرقی اور طالب نہیں شخصیت رخصت ہو چکی ہے، اور کچھ نہ کہا

غمرِ مرتی و رجبِ طالبِ مُرد  
اسد اللہ خاں غالبِ مُرد

ترجمہ: غمرِ مرتی اور رجبِ طالبِ مُرد  
اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہو گیا

۳

اے کہ ہا انوری برابرِ بود  
مخلص جملہ مہرِ انورِ بود

ترجمہ: اے وہ مخلص کہ انوری کے برابر تھا  
اس کے تمام شعر آفتابِ انور تھے

بیشِ آں بیشِ کو پہ فنِ سخن  
بیشِ تر آں کہ بود کم تر بود

ترجمہ: سخنِ ہوی میں اس ہر اک سے بہتر شعر کہنے والے کے مقابلے میں  
ہر ایک کا بہتر کہا ہوا بھی کم تر تھا

ور سپاسِ کلامِ شیرِ بخش  
تر دہاں آں کہ بود کوثرِ بود

ترجمہ: اس کے کلام شیریں کی سپاس گزاری میں  
بھڑے کوڑ بھی تر زبان تھا

شکر خسرواں چناں نہ بود  
رتبہ اش پیش خلق دیگر بود

ترجمہ: بادشاہوں کی شان بھی ایسی نہیں ہوتی  
لوگوں میں اس کا مرتبہ اور طرح کا تھا

شہرت او بہ ہفت چرخ ہنود  
اسی کہ گوید بہ ہفت کشور بود

ترجمہ: اس کی شہرت تو سات آسمانوں میں آج بھی ہے  
بھلا پہ کس نے کہا کہ ہفت کشور میں تھی

لفظے از دے ہزار معنی داشت  
حرفے از دے ہزار دفتر بود

ترجمہ: اس کے ایک لفظ کے ہزاروں معنی ہوتے تھے  
(اور) اس کا ایک حرف ہزار دفتر کے برابر تھا



از نکھائی ہم آں کہ بعد سستی  
بہر الم نظم المہر بود

ترجمہ: وہی تھا جو نکھائی سے بہت لے گیا  
وہ شاعروں کے سر کا تاج تھا

تاچہ روشن کلام او کوئی  
نقطہ او باہر نقطہ اختر بود

ترجمہ: اس کا کلام ایسا روشن تھا کوئی  
نقطہ چاند اور نقطہ ستارہ تھا

بعد او یوں کے معلوم  
در حیاتش باو کہ ہم سر بود

ترجمہ: اس کے بعد (اس مرتبے پر) پہلا کون پہنچ سکتا ہے  
جب اس کی زندگی میں کوئی اس کا ہم سر نہ ہوا

چہ بختی ی غورم قسم صد ہار  
کز دل و جان فدائے حیدر بود

ترجمہ: میں غلّی کی سو پار قسم کھا کر کہتا ہوں  
وہ دل و جان سے حیدرؔ پر فدا تھا

انچہ می یافتے پہ خویش نہ داشت  
وہ انچہ می خواستے منیرؔ بود

ترجمہ: جو کچھ بھی اس کو حاصل ہوتا، اپنے پاس نہ رکھتا  
اور جو کچھ بھی مانگتا، مل جاتا تھا

بود از بس صفا بہ آب بکاش  
نہ شنیدم کہے مکدرؔ بود

ترجمہ: اس کی فطرت میں اس پایے کی صفا تھی  
کہ کبھی یہ نہیں سنا گیا کہ کسی کی طبیعت مکدر ہوئی ہو

ہر دم او ہزار کس موجود  
خود و لیکن، مقیم یک دم بود

ترجمہ: اس کے ہاں ہزاروں لوگ موجود ہوتے  
لیکن وہ ایک جگہ پر ہی مقیم رہتا

چہ طوٹیں ایں مہکتے کز پہ مجمعِ عام  
شخصِ بنس کہ روحِ پھور ہو

کسی نے مجمعِ عام میں سے کیا خوب کہا ہے  
کہ اس کا کلام روحِ پھور تھا

ترجمہ:

ق

چہ قدرِ بڑا پہ پُرِ دلانِ سخن  
اسد اللہ خاں دلاور ہو

ق

بہادرانِ سخن کے مقابلے پہ  
اسد اللہ خاں کس قدر بہادر تھا

ترجمہ:

کج کسانے کہ راہِ می دھند  
بہر شاں رہ نما چہ مسلر ہو

راہِ سخن میں جو لوگ کج راہ تھے  
ان کے لیے غالب مسلر کی طرح راہ نما تھا

ترجمہ:

تاچہ از کس حسد پہ کلیمِ او را  
آں قدر قدرت از مقدر ہو

ترجمہ: کسی کو اس کی شاعری پر اس سے حسد کا کیا جواز ہے  
یہ تو معنی ہی کا فیصلہ تھا

گر کسے ہزار پیش آدروے  
کے کرتے دیش تو نگر ہو

ترجمہ: اگر کبھی کوئی تیرا نہ اس کو پیش کرتا  
(تو) قبول نہ کرتا اس کا دل ایسا سیر چشم تھا

ککتے داشت در سخن کز دے  
مغر موحاتیاں معطر ہو

ترجمہ: اس کی شاعری میں وہ ککتے آفرینی تھی  
(ک) فرشتوں کا دماغ معطر رہتا

مصرعے حائلے مسخر کرو  
تجی او ما دگر چہ جوہر ہو

ترجمہ: اس کا ایک مصرع نے دنیا - مسخر کر لیتا  
یہی تو اس کی تلواریں کا جوہر تھا

صحب طبع او جزاک اللہ!  
ہر چہ ی گفت جملہ کوہر ہو

ترجمہ: جزاک اللہ! اس کی کان طبع ایسی تھی  
کہ اس کلم سے جو بھی نکلتا، سوتلی ہی ہوتا تھا

ہر روحانیاں سمجھتے اقرار  
اُو ز روحانیاں مقرر ہوا

ترجمہ: سارے فرشتے یہ مانتے ہیں  
کہ وہ بھی ایک فرشتہ ہی تھا

گم نہ جمید کس نہ جانست  
وہ کنش آں زباں کہ ساغر ہوا

ترجمہ: کوئی اس کو جمید سے کم نہیں سمجھتا تھا  
جس وقت اس کے ہاتھ میں ساغر ہوتا

از فروغ وجود اُو ہر دم  
خوان اُو تا چہ منور ہوا

ترجمہ: اس کے وجود کی روشنی سے  
اس کا خوان (فیض) کس قدر منور تھا

سید فرید بہ دام ی آورد  
میل اُو کے بہ صید لاغر ہوا

ترجمہ: وہ ہمیشہ سونا چھار جال میں پہانتا  
بھی لائو چھار کی طرف توجہ نہ کرتا

ق

یعنی آں معنی بلند کزو  
سدہ ہم پست و ہم فرد تر بود

ق

ترجمہ: یعنی (اس کا دام فکر) ایسے معنی بلند دام میں لاتا  
کہ سدہ بھی پست اور فرد تر معلوم ہوتی

آزمووم ہزار بار اہی را  
چشما او کم تر از عارف در بود

ترجمہ: میں نے ہزار بار آزما کر دیکھا  
اس کی نظر میں روپیہ جیسے پتھر سے بھی کم تر تھا

از دگر علم تا چہ حرف، او را  
ہمہ علم الہی ازیر بود

ترجمہ: دوسرے علوم کی کیا بات کی جائے  
اس کو سارا علم الہی ازیر تھا

الغرض بعد نردیش چہ زباں  
غیر ازینا نقد را نہ دیگر بعد

ترجمہ: الغرض، اس کے مرنے کے بعد  
نقد کی زبان پر صرف یہی الفاظ تھے

فخر مرئی و رجبِ طالبِ نرد  
اسد اللہ خاں غالبِ نرد

ترجمہ: فخر مرئی اور رجبِ طالبِ طالب  
اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہو گیا

۳

اسد اللہ خاں نہ مامد، افسوس!  
فخر ہندوستان نہ مامد، افسوس!

ترجمہ: افسوس! اسد اللہ خاں (دنیا میں) نہ رہا  
افسوس! فخر ہندوستان نہ رہا

ایں نہ کویم کہ آں نہ مامد، افسوس!  
وہ تہی خلق جاں نہ مامد، افسوس!

ترجمہ: میں یہ نہیں سمجھتا کہ وہ نہیں رہا  
بلکہ افسوس! مخلوق کے جسم میں جاں نہ رہی

مانم آئینہ ساں نہ چوں حیراں  
طوطی خوش جاں نہ مانم، افسوس!

ترجمہ: میں آئینے کی طرح حیران کیوں نہ ہوں  
(کہ) افسوس! طوطی خوش جاں نہ رہا

رفت بکوش سامعین غلجے  
لب او ذرفٹاں نہ مانم، افسوس!

ترجمہ: سامعین کے کانوں پر (بڑا) غم ہوا  
افسوس! اس کا لبِ ذرفٹاں نہ رہا

بوستان بود دلی و بے او  
رواق بوستان نہ مانم، افسوس!

ترجمہ: دلی تو ایک باغ تھا، اب اس کے بغیر  
افسوس! باغ کی رواقِ شمع ہو گئی



خاندانِ را دگر چہ نامہ شرف  
شرفِ خاندان نہ نامہ، افسوس!

ترجمہ: خاندان کے لیے اب کوئی وسیلہ عزت ہی نہ رہا  
افسوس! خاندان کی عزت من گئی

نظم اُو نامہ جاوداں لقنا  
خوشن جاوداں نہ نامہ، افسوس!

ترجمہ: اس کی شاعری تو جاوداں ہو گئی  
لیکن افسوس! خود اس کا وجود جاوداں نہ ہو سکا

یو جانِ جہاں خود آں کہ دگر  
نظمے در جہاں نہ نامہ، افسوس!

ترجمہ: وہ تو اس دنیا کی جان تھا لیکن  
افسوس! کہ کوئی دوسرا (ایسا) دنیا میں نہ رہا

کاروانِ دگر کجا نامہ  
بودیک کاروان نہ نامہ، افسوس!

ترجمہ: دوسرا کارواں کہاں ٹھہرے گا  
ایک ہی کارواں تھا، افسوس! جب وہ بھی نہ رہا

آسمان و چٹیں ستم بر من  
اثر اندر فغاں نہ ماند، افسوس!

ترجمہ: آسمان کے ایسے ستم میرے اوپر ہیں  
افسوس! کہ میری فغاں میں اثر باقی نہ رہا

دہر را غم گرفت زیرِ تکیں  
تھم شادی رواں نہ ماند، افسوس!

ترجمہ: غم نے زمانے کو مسخر کر لیا  
اور افسوس! شادمانی کی سلطنت ختم ہو گئی

کز چو پرسیدہ اند و ہم کلفتم  
کہ چو کام نہ ماند، افسوس!

ترجمہ: لوگوں نے پوچھا بھی ہے اور میں نے بتایا بھی  
اے کہ افسوس! میرے جالو سے میری زبان نکل گئی

اے اس مصرعے کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ افسوس اب میری زبان کا کوئی مقصد ہی نہ رہا۔

چند گرم نہ ماند خوں پہ جگر  
چند گویم فلاں نہ ماند افسوس!

ترجمہ: کس قدر زاری کروں، جگر میں قطرۂ خوں باقی نہیں  
اور افسوس! کب تک تباؤں کہ فلاں شخص مر گیا

ہر لب آں کہ مردش چو شنید  
تا قیامت چہاں ماند افسوس!

ترجمہ: اس کی زبان پر کہ جس نے اس کی وفات کی خبر سنی  
افسوس! قیامت تک کیسے کیسے نالے نہ رہے

من پہ خاکش چہ گورم تھا  
دل در خوں تہاں نہ ماند افسوس!

ترجمہ: اب میں اس کی قبر پر اکیلا کیا جاؤں  
اے افسوس! خوں میں ترپنے والا دل ہی نہ رہا

ہر کہ پسد چہ صدمہ اش گویم  
رو سوے آسماں نہ ماند افسوس!

ترجمہ: کوئی پوچھے تو اس کو کیا سانچہ بتاؤں  
افسوس! آسمان کی طرف کا راستہ ہی بند ہو گیا

ناز برصیر غوشتیں دل داشت  
ہر چہ دل داشت آن، نہ ماند، افسوس!

ترجمہ: دل کو اپنے صبر پہ بڑا ناز تھا  
لیکن افسوس! دل کے پاس جو کچھ بھی تھا، نہ رہا

تا بہ دارالاماں چہ بے اد، ذکر  
اندھیں دار اماں نمائند، افسوس!

ترجمہ: اس کے بغیر دارالاماں کا کیا ذکر کیا جائے  
کہ افسوس! اس گھر سے اماں کی اٹھ گئی

داشت صد رہ جوانی از یک ہر  
وقت دوراں جواں نہ ماند، افسوس!

ترجمہ: ایک بوڑھے کے ویلے سے بیکڑوں اسباب جوانی میسر تھے  
لیکن افسوس! راجی وقت ہی بوڑھا ہو گیا

شاد و غم و غم چناں کہ ماند  
بخش ازین چناں نہ ماند، افسوس!

اس سے پہلے جیسا شاد و غم میرا دل  
ہوا کرتا تھا افسوس! اب دیا نہ رہا

چہ کچے رختش ز من یک بار  
تاب رفت و توان نہ ماند، افسوس!

ایک اس کے چلے جانے سے یک بارگی  
افسوس! ساری تاب و توان ہی زائل ہو گئی

دل من ہم چہ سینہ چوں ماند  
کاں کیں در مکاں نہ ماند، افسوس!

میرا دل سینے میں کس طرح ٹھہرے  
جب افسوس! وہ کہیں ہی مکاں میں نہ رہا

شفقت و مہر ہر دو گشت فنا  
مشفق و مہرباں، نہ ماند، افسوس!

ترجمہ: شفقت و محبت، دونوں ہی فنا ہو گئیں  
چوں کہ افسوس! عشق و مہرباں ہی نہ رہا

گفت کس آن زماں کہ غالب مرد  
بچ دو دے گماں نہ ماندا افسوس!

ترجمہ: غالب کے مرنے کا چرچا تو اس وقت ہوا  
جب افسوس! اس امر میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہا

من زمانے کے شادی مانم  
کو دگر آن زماں نہ ماندا افسوس!

ترجمہ: کبھی میں بھی خوش ہوا کرتا تھا  
افسوس! اب وہ وقت نہ رہا

تا چہا خوں شد و ز دیدہ چکید  
رازِ این دل نہاں نہ ماندا افسوس!

ترجمہ: کیسا کیسا غم ہو ہو کر آنکھ سے پڑا  
افسوس! دل کا راز پوشیدہ نہ رہ سکا

آں کہ نامش پہ ہر کچا شبنوی  
از وجودش نشان نہ ماند، افسوس!

ترجمہ: اُس شخص کا نام تو ہر جگہ سنائی دیتا ہے  
لیکن افسوس! اس کے وجود کا نشان باقی نہ رہا

مشتِ خاک کے کہ ہر سر افشام  
اندریں خاکداں نماد، افسوس!

ترجمہ: افسوس! مٹی بھر خاک کے میں اپنے سر پر ڈال سکوں  
اس خاک دان میں میٹر نہیں

میںہاں صد ہزار ہر سرِ خواں  
ایک ایک میزبان نہ ماند، افسوس!

ترجمہ: لاکھوں مہمان دستِ طوائف پہ بیٹھے ہیں  
لیکن افسوس! ایک میزبان باقی نہ رہا

ساکل آ کہ پہ بود آں دلِ دوست  
طیرت بحر و کاں نہ ماند، افسوس!

ترجمہ: وہ دل دار کیا کہہ سائل آگاہ تھا  
انہوں! وہ رھب بحر و کائنات رہا

تا چمکے نقشہ پر لب ایں دستاں  
تا کہا پر زبانِ نثار، انہوں!

ترجمہ: نقشہ! یہ قصہ غم کب تک؟  
اور زبان پر "نثار انہوں!" کہاں تک رہے گا

خمرِ مرتی و رھبِ غالبِ نرد  
اسد اللہ خاں غالبِ نرد

ترجمہ: خمرِ مرتی و رھبِ غالبِ نرد  
اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہو گیا

۵

ایک دل است و ہزار غم چہ کسم  
نہ کسم دم مرگ ہم چہ کسم

ترجمہ: ایک دل ہے اور ہزاروں غم، کیا کروں  
موت بھی دم چھیں کرتی، کیا کروں



اے کہ کوئی کہ مہر کن دو سر روز  
زندگی بہت یک دو دم چہ کسم

ترجمہ: اے طالب! تو جو کہتا ہے کہ ایک دو روز مہر کر  
ساری زندگی ہی ایک دو روزوں سے بڑھ کر نہیں، کیا کروں

فلک و دہر و بخت و بخت  
چہ آزاد من بزم چہ کسم

ترجمہ: آسمان و زمانہ و قسمت مجھے آزاد  
دینے کے لیے حقد ہو گئے ہیں، کیا کروں

چوں نہ سازم چہ کج کای با  
قلم محنت جملہ کسم چہ کسم

ترجمہ: اپنی ناکامیوں سے کس طرح نہ بچاؤں  
میری ساری شادمانی زہر ہو گئی ہے، کیا کروں

اے کہ کوئی خورد دماغ مرا  
شرع اعداء خویش کسم چہ کسم

ترجمہ: اے مخاطب! تُو جو کہتا ہے کہ میرا دماغ نہ کھا! میں اپنے قصہٴ غم کو کس طرح مختصر کروں

تاچہ نہ نمود نہ بہن نمود (کذا)  
شکوہ طالع وژم، چہ کسم

ترجمہ: منتیں واضح نہیں  
اپنی بد قسمتی کا کیا گلہ کروں

گر یہ ی خواہم کسم بہ عمر  
چوں بہ چشم نمانم، چہ کسم

ترجمہ: خواہش تو یہ تھی کہ ساری عمر روتا ہی رہوں  
لیکن اب تو آنکھیں بھی خشک ہو گئیں، کیا کیا جائے

بگورم من چساں ز سوز و گداز  
کذا و مرا الم، چہ کسم

ترجمہ: سوز و گداز سے مجھے کس طرح نجات ملے  
غم میرا پیچھا نہیں چھوڑتا، کیا کروں

تاچہ کے دل کھد فغاں چہ علاج  
تا کھا من کھم ستم، چہ کھم

ترجمہ: دل آہ و زاری کب تک کرے گا، اس کا کیا علاج ہے  
اور میں کب تک ستم اٹھاؤں گا، آخر کیا کیا جائے

اسد اللہ خاں غالب ہنس  
کمر اکنوں سوے عدم، چہ کھم

ترجمہ: اسد اللہ خاں غالب نے اب  
راہ عدم کے لیے کمر کس لی، کیا کروں؟

رقم من انچہ کردم اعجاز اسف  
سید او جزیں رقم، چہ کھم

ترجمہ: میں نے جو کچھ تحریر کیا، وہ اعجاز ہے  
اپنے حق میں غالب کی اس سند کے علاوہ کیا پیش کروں

جا بجا کردم و چو اوے را  
یاہم اصلا نہ در بگم، چہ کھم

ترجمہ: جا بجا تلاش کروں اور اُس جیسا ایک بھی  
جہنم (ایران) میں بھی نہ ملے تو کیا کروں

در غمش شرح ناتواںی غویش  
از کھم چوں کند قلم، چه کنم

ترجمہ: اُس کے اظہارِ غم میں جب  
میرے ہاتھ کا قلم بھی اپنی عاجزی پیش کرے تو کیا کروں

بود چه از ارم یہ اُو بدون  
گر دہندم بے اُو ارم، چه کنم

ترجمہ: اُس کی رفاقتِ جنت سے بہتر تھی  
اگر اُس کے بغیر جنت بھی مجھے دیں تو میں میرے کس کام کی

جدہ گاہ من آستانش بود  
سے مخراب پشتِ غم، چه کنم

ترجمہ: اُس کا آستانہ میری جدہ گاہ تھی  
اب مسجد میں جدہ کیا کروں

آن سفالیں پیالہ چوں اکٹوں  
از کفش نیست جام جم، چہ کنم

ترجمہ: وہ مٹی کا پیالہ اب اگر اس کے ہاتھ سے مجھے نہیں مل رہا  
تو میں جام جم کا کیا کروں گا

یا آرد می شنیدم آن کلمات  
یا شنیدم ایں زماں اہم، چہ کنم

ترجمہ: یا تو میں اس کی باتیں سنا کرتا  
اور اب یہ وقت آ گیا ہے کو یا بھرا ہو گیا ہوں، کیا کیا جائے

ان کرا رام بودم اکٹوں کو  
نہ کنم گر ز خویش رم، چہ کنم

ترجمہ: میں جس کا ارادت مند تھا، اب کہاں ہے  
اب اگر اپنے سے بھی فرار نہ ڈھونڈوں تو کیا کروں

آں کہ ہے دوست زندگی ہم بیچ  
خود بہ آد می خورم قسم، چہ کنم

ترجمہ: وہ کہ جس کے بغیر زندگی ہی بے معنی ہے  
اب اس کی قسم کھانے کے علاوہ اور کیا کیا جائے

قبرِ اُو چشم از حرم کم نیست  
تا بود قبرِ اُو حرم، چہ کنم

ترجمہ: اس کا حزار میرے لیے حرم سے کم نہیں  
اس حزار کو حرم کھانے کے لیے کیا کروں

عشقم آں کہ بود رفت اکنوں  
چرخ اگر عظیم چشم، چہ کنم

ترجمہ: اب صاحبِ عشق تو جا چکا ہے  
آسمان مجھے چشم عطا کرے بھی تو میرے کس کام کا

شاہِ بوم چو بود اُو اکنوں  
من فقیرم عشقم خدم، کنم

ترجمہ: جب وہ زندہ تھا تو میں باو شاہ تھا  
لیکن اب تو فقیر ہوں، سو، عشق و خدم میرے لیے بے کار ہیں

یاد آن راحت کہ با او بود  
دچم رنج دم چ دم، چہ ستم

ترجمہ: اس راحت کی یاد کہ جو اس کے سبب تھی  
گھڑی گھڑی آکر مجھے دکھ دیتی ہے، کیا کروں

ایں ہمہ کرد باز گوید دہر  
تج بر ناکسہ ستم، چہ ستم

ترجمہ: یہ ستم کرنے کے بعد بھی زمانہ کہتا ہے  
کہ کسی بے حیثیت پر تلوار نہ اٹھاؤ، کیا کروں

حیف! نرد آن کہ ہر زماں می کرد  
بہمن آن لطف، آن کرم، چہ ستم

ترجمہ: افسوس! وہ شخص کہ مجھ پر ہمیشہ  
کیسے کیسے لطف و کرم کرتا تھا، مر گیا، اب میں کیا کروں

طلبد با خودم اجل و ز ضعف  
بر نہ خیزد مرا قدم، چہ ستم

ترجمہ: موت چاہتی ہے کہ میں اس کے ساتھ ساتھ رہوں  
لیکن خدا نے ناتوانی سے میرا قدم نہیں اٹھتا، کیا کروں

ہاں کلیم من و کلمہ اعدا  
چہ کلیم چوں مقیم، چہ کلم

ترجمہ: مجھے صبر نہیں آ رہا لیکن دشمن  
مجھ پر صبر کی تہمت لگا رہے ہیں، کیا کروں

ہر دم ی شود فزوں ہے او  
رنج بر رنج و غم چہ غم، چہ کلم

ترجمہ: ہر لمحہ اس کے بغیر  
میرا رنج و غم بڑھتا ہی جا رہا ہے، کیا کروں

خود فغانم چہ کم چہ ہرزہ دؤم  
کوش بر ہانگہ زہروم، چہ کلم

ترجمہ: میری فغاں کیا کم ہے کہ فضول ادھر ادھر بھاگوں بھی  
اور آوازوں کے زہروم پر کان بھی دھروں



بود دور عاقلی دلم کہ سحر  
شد بہ دیوانگی علم، چہ ستم

ترجمہ: میرا دل فرزانگی کے کیف میں تھا کہ بکا یک  
ایک صبح دیوانگی کے عالم میں برا بیعت کھڑا ہو گیا، کیا کروں

تقدّا از درد من نہ ای آم  
گر نہ ہر دم فغاں ستم، چہ ستم

ترجمہ: اے تقدّا تجھے میری دکھ سے آگاہی نہیں  
میں ہر دم آہ و زاری نہ کروں تو اور کیا کروں

فخر مرقی و رھب غالب مُرد  
اسد اللہ خاں غالب مُرد

ترجمہ: (نور) فخر مرقی و رھب غالب  
اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہو گیا

۶

میرزا غالب، آہا غفلت بہ کور  
چوں نہ پرشم کفن من مجبور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب قبر میں جا سویا  
میں فراقِ زودہ (اس غم میں) کفن کیوں نہ پہن لوں

میرزا غالب، آہ! زودہ نہ مانو  
چوں نہ باشم من از حیاتِ کفور

ترجمہ: ہائے! میرزا غالب زودہ نہ رہے  
سو میں دغی کو کیوں نہ ٹھکراؤں

میرزا غالب، آہ! قصہ عدم  
کرد خود اختیار و من مجبور

ترجمہ: ہائے! میرزا غالب راضی ملکِ عدم ہوے  
اور میں فرقتِ زودہ رہ گیا

میرزا غالب، آہ! اندر جلد  
سرخوش و من بنور طالبِ حور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب جنت میں سرخوش و سرشار ہیں  
اور میں تا حال طلبِ حور میں جلا ہوں

میرزا غالب، آہ! نزدیک است  
چہ ہزاراں سرور و من زو دور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کمال سرور میں  
ہیں لیکن میں ان سے دور ہوں

میرزا غالب، آہ! بے من خاست  
ایں قدر چوں سرور نا محصور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب میرے بغیر  
نہیں ہے اچھا کی طرح اٹھ گیا

میرزا غالب، آہ! ایں چہ محصور  
در چنانہش شکایت است ضرور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب نے یہ کیا کر ڈالا  
ان کی خدمت میں یہ گلہ لازمی ہے

میرزا غالب، آہ! منظر فیض  
بود چشماں کزو حضور و ظہور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب جو مظہر فیض تھے  
سارا نور ظہور ان ہی کے دم قدم سے تھا

میرزا غالب، آہ! نرد نہ خود  
تا خودم تا مرا دریاں چہ قصور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب جب خود ہی مجھے  
اپنے ہاتھ نہ لے گئے تو میرا کیا قصور

میرزا غالب، آہ! داشت چہا  
تا سروشان غیب ذوق ظہور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کو عالم غیب  
کے فرشتوں سے ملنے کا کیسا شوق تھا

میرزا غالب، آہ! آں کہ مجھے  
کم نہ دستش من از فقہور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کو میں نے  
کبھی شاہ چین سے کم نہیں جانا

میرزا غالب، آہ! آں کہ سنوں  
خوابش غلق غالب، مغفور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کہ جن کو لوگ  
اب مرحوم کہنے لگے ہیں

میرزا غالب، آہ! آں کہ ہنوز  
مدح خوانان او اثاث و ذکور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کہ جن کی اب  
عورتیں اور مرد سب تعریف کرتے ہیں

میرزا غالب، آہ! آں کہ وقاش  
نہ بہ یک جا ہزار جا مذکور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کہ جن کی محبت کا  
ایک نہیں ہزار جگہ خیر چاہے

میرزا غالب، آہ! آں کہ مرد  
متم شد جملہ فہم و عقل و شعور

ترجمہ: آوا میرزا غالب کہ جن پر سارے  
فہم و عقل و شعور تمام ہو گئے

میرزا غالب، آوا آں کہ ز من  
ی شنیدے غزل بہ ذوق و نور

ترجمہ: آوا میرزا غالب کہ جو مجھ سے  
بڑی ذوق و شوق سے غزل سنا کرتے تھے

میرزا غالب، آوا آں کو را  
دام از جان و دل دھوش و طیور

ترجمہ: آوا میرزا غالب کہ جن کے  
تمام پندے اور جانور تابع فرمان تھے

میرزا غالب، آوا آں عاشق  
کہ یکے کوہ کن برش مزدور

ترجمہ: آوا میرزا غالب ایسے عاشق  
کہ کوہ کن کے ساتھ ساتھ مزدور بھی تھے

میرزا غالب، آہا در فنِ شاعر  
بود چوں بادشہ منش دستور

ترجمہ: آہا میرزا غالب کہ فنِ شاعری میں  
بادشاہ اور میں ان کے وزیر کی طرح تھا

میرزا غالب، آہا ی فہید  
ہرچہ ی بود در دلم مستور

ترجمہ: آہا میرزا غالب کہ مجھ جانتے تھے  
جو کچھ بھی میرے دل میں پہنچا ہوتا

میرزا غالب، آہا از نظرم  
رفت چوں دور شد چہ اش منکھور

ترجمہ: آہا میرزا غالب میری نظر سے کس طرح  
دور ہو گئے اور وہ کیا چاہتے تھے

میرزا غالب، آہا نرد و بدل  
شد بہ ماتم زمان را بہ سود

ترجمہ: آہا میرزا غالب انتقال کر گئے اور  
زمانے کی شادمانی ماتم میں تبدیل ہو گئی

میرزا غالب، آہا ی عجب  
چہ قدر زر بہ سرو ہے مقدور

ترجمہ: آہا میرزا غالب جو کسی بے حیثیت  
انسان کو بھی بے حساب زر دے دیتے تھے

میرزا غالب، آہا سوئی بود  
اعتقاد مرا و دلی طور

ترجمہ: آہا میرے اعتقاد کے مطابق تو میرزا غالب  
سوئی تھے اور دلی کوہ طور تھی

میرزا غالب، آہا آں کہ منم  
سایہ او را و او سراپا نور

ترجمہ: آہا میرزا غالب سراپا نور اور  
میں ان کے سایے کی مانند تھا



میرزا غالب، آہ! چوں کوچید  
شد بہ ملکِ سخن ہزار فتور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب جب کوچ کر گئے (تو)  
سلطنت شاعری میں ہزاروں خرابیاں پیدا ہو گئیں

میرزا غالب، آہ! فرد و مرا  
د آتشِ غصہ سینہ رشکِ خود

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کا انتقال ہو گیا اور  
اس دکھ کی آگ سے میرا سینہ رشکِ خود ہو رہا ہے

میرزا غالب، آہ! کہ مرا ست  
روزِ روشن ہم شبِ دہجور

ترجمہ: آہ! میرزا غالب کہاں گئے  
کہ میرا روزِ روشن کلیتہً اندھیری رات ہو گیا

میرزا غالب، آہ! کے دام  
کہ چہ از غمش دل معصوم

ترجمہ: آوا میرزا قلاب کو کیا معلوم  
کہ ان کے کیسے کیسے دکھ میرے دل پر مسلط ہیں

نقد معلوم ہی تو اس بدون  
تو چہ اس لفظ بودہ مسرور

ترجمہ: نقد! بھلا تو اس لیے خوش کیوں تھا  
البتہ معلوم ہوتا تو بہر حال جائز ہے

فخر مرئی و رجب قلاب فرد  
اسد اللہ خاں قلاب فرد

ترجمہ: (کہ) فخر مرئی و رجب قلاب  
اسد اللہ خاں قلاب کا انتقال ہو گیا ہے

داد چرخ حکم بر باد  
داد از دست اس حکم داد

ترجمہ: اگرچہ چرخ حکم کرنے مجھے بر باد کر دیا  
(لیکن) اس حکم کرنے کے ہاتھ ہی سے داد بھی دی

انچہ . از فوت میرزا غالب  
ہر من اللہ ہر کسے نہ قیاد

ترجمہ: میرزا غالب کی موت سے جو اقدار  
مجھ پر پڑی ایسی کسی پر نہیں پڑی

نکتہ زانی دگر کہا اکٹوں  
شد نہ دہر آں کہ نکتہ ہا ی زاد

ترجمہ: اب نکتہ آفرینی کہاں اور کیوں کر (ہو)  
کہ نکتہ آفرین ہی دنیا سے چلا گیا

سایہ برداشت از سرم ای دانے!  
آں کہ مانند سرد بود آزاد

ترجمہ: ہائے میرے سر سے سایہ اٹھا لیا  
اس نے جو سرد کی طرح آزاد تھا

او چو آباد کرد بخت را  
من نہ باشم دریں خراب آباد

ترجمہ: اس نے تو جا کر جنت آباد کر لی  
تو میں بھی اب اس خراب آباد (دنیا) میں نہیں رہوں گا

شادیم رشت بست و نواں مرد  
نام شادیے ہم سن ناشاد

ترجمہ: میری شادمانی نے رنج سفر باعدہ لیا  
لیکن وہ مجھ ناشاد سے شادمانی کے نام کو نہیں لے جاسکتی

گریم آں دم کہ در غمش خود ابر  
نہ تواند بہ چرخا من استاد

ترجمہ: اس وقت مجھے (اور بھی) دعا آتا ہے جب اس کے غم میں  
میرے سامنے ابر بھی نہیں ظہر سکتا

خود سوے غلہ رخش عزم دوا  
داد عمر مرا کسے کہ بہ پانہ

ترجمہ: جس نے میری زندگی برباد کر دی  
اس نے خود گھوڑا جنت کی طرف دوڑا دیا

بیس زمیں سخت، آسمان دور است  
از کہ جویم منہ ایسا فرماں اعدا

ترجمہ: زمین بہت سخت اور آسمان بہت دور ہے  
اس وقت میں کسی سے مدد مانگوں

چہ دعاے بلا کہ ی میرم  
زندگی جملہ فتنہ است و فساد

ترجمہ: میں تو مری رہا ہوں، اب زندگی کی دعا کیا کرنا  
کہ زندگی سراسر فتنہ و فساد (ہی) ہے

آں کہ را بود عقل گل شاگرد  
فتنہ را بود بیس جہاں استاد

ترجمہ: جبرئیل تو اس کے شاگرد تھے  
جب کہ فتنے کا استاد سارا عالم تھا

بدر گوش از بچے شیراز  
ی زخم جام ہر چہ بانا باد

ترجمہ: شیراز کی روایت کے مطابق اس کی قبر پر  
میں شراب پی رہا ہوں، ہر چہ پادا باد

سوے ملکِ عدم نہاد قدم  
اسد اللہ خانِ پاک نہاد

ترجمہ: اسد اللہ خاں پاک طہیست  
ملکِ عدم کی طرف روانہ ہو گئے

حسبِ عالم ہمیں مقام بود  
اسی کہ گفتہ است پیش ازین استاد

ترجمہ: یقیناً میرے حسبِ حال یہی مقام ہو گا  
وہ جو اس سے پہلے ہی استاد کہہ گئے ہیں

دہ دلم چوں نہ رہ کند اندوہ  
بدلم چوں نہ جاں کند فریاد

ترجمہ: غم میرے دل میں کیوں نہ رہ بٹائے  
اور جان میرے ہونٹوں پر فریاد بن کر کیوں نہ آئے

فخر مرئی و رشکِ طالبِ نرد  
اسد اللہ خاں غائبِ نرد

ترجمہ: (ک) فخر مرئی و رشکِ طالبِ  
اسد اللہ خاں غائب کا انتقال ہو گیا

۸

من چہ گویم کہ حالِ دلِ چون است  
صبحِ مغموم و شامِ محزون است

ترجمہ: کیا کہوں کہ دل کا کیا احوال ہے  
صبحِ غم گین ہے اور شامِ الم ناک

دشمنِ عرصہ کرد بر من تھک  
سردکارم کتوں بہ ہامون است

ترجمہ: میری دہشت نے مجھ پر عرصہ حیات تھک کر دیا ہے  
اب میرا سردکار جنگلوں سے ہے

اگر یہ دیکر چہ رنگِ من خواہد؟  
کوئی آفاقِ جملہ کھلوں است

ترجمہ: میرا گریہ میرا اور کون سا رنگ چاہتا ہے  
جب کہ پہلو سے اس کی کائنات (کتاب کی سہ کے سب الجھان ہے

غیر من کز خداش می خواہم  
کیست آں کو ز مرگ ممنون است

ترجمہ: میرے علاوہ دوسرا کون خدا سے اس کا منتفی ہے  
(میں ہی) موت کا ممنون ہوں

حال یک یک چہ با کسے گویم  
دل جدا و جگر جدا - خون است

ترجمہ: ایک ایک کا حال کسی سے کیا کہوں  
دل اپنی اور جگر اپنی جگہ خون ہو گیا ہے

ایں نہ دائم کدام مُرد ولے  
صد تنہا چہ سینہ دفون ست

ترجمہ: میں یہ سمجھ نہیں پاتا کہ موت کس کو آئی  
(میں اب کہتا ہوں) کہ تنہا میں میرے سینہ میں دفون ہو گئی



اسد اللہ خاں نہ آں کہ ارد  
بیچ صاحب غرض نہ ممنون است

ترجمہ: اسد اللہ خاں تو وہ شخص تھے کہ  
ہر غرض مند ان کا احسان مند ہے

چشم عقل اسد مکتبہ غالب  
عقل کل ہم ہاں چہ مقنون است

ترجمہ: غالب کا کلام عقل کے سامنے ہے  
اس پر تو جبرئیل بھی عاشق ہے

سرخوش رفتہ و ز رفتن او  
جام کام زمانہ واژگون است

ترجمہ: غالب تو مست عدم کو سدھارے لیکن ان کے  
جانے سے دنیا کے مقصود کا خیال الٹا ہو گیا ہے

بعد مرگ دے از بھائش  
عاقل آں مکی کہ بہود مجنون است

ترجمہ: اس کی موت کے بعد اس کے دوستوں میں جو عاقل تھا، وہ بھتوں ہو گیا ہے

او کس بے کساں چو بود اکٹوں  
حال ما بے کساں وگر کون است

ترجمہ: بے کسوں کا وہی تو سہارا تھا لیکن اب ہم بے کسوں کا حال چاہ ہو گیا ہے

کنہ از صدق اعتقاد امروز  
ہر کہ فرش بیاں فریون است

ترجمہ: متن واضح نہیں

از حد افزوں چو بود در ہر علم  
صفتش از بیان افزوں است

ترجمہ: وہ چوں کہ ہر علم میں حد سے زیادہ تھا اس کی تعریف بھی بیان سے باہر ہے

میں نہ خواہم صبور ہے او ماند  
ایں چہ افسانہ و چہ افسون است

ترجمہ: مجھے اس کے بغیر صبر نہیں آئے گا  
یہ سانحات کا کیسا سر و ظلم ہے

فخر مرئی و رجبِ طالبِ نرد  
اسد اللہ خاں غالبِ نرد

ترجمہ: (کہ) فخرِ مرئی و رجبِ طالب  
اسد اللہ خاں کا انتقال ہو گیا

۹

چند گویم کہ کوہ و کاہ ایں جا ست  
یعنی امداد از صداست زیاد

ترجمہ: کب تک بیان کروں کہ راوحیات میں بڑی مشکلات ہیں  
یعنی حد سے زیادہ دکھ ہیں

یو دینِ پیشِ طرفِ حافظہ ام  
غیرنیاں سکنوں نہ دارم یاد

ترجمہ: ایک زمانے میں مرا جانکدہ کیا حیرت انگیز تھا  
اور اب سوائے فراموشی کے کچھ بھی یاد نہیں

اے کہ کفکی فراشت نہ کسم  
رفت و یک رقد نیز فرستاد

ترجمہ: تم تو کہتے تھے کہ تجھے نہیں بھولوں گا  
اب مجھے ہو تو ایک رقد بھی نہیں بھجا

کام دل فرد بر سر نعلین  
ی روم نوح ی کسم فریاد

ترجمہ: مقصد دل فوت ہو گیا ہے  
اب میں جاتا ہوں اور اس کی لاش پر نوحہ خوانی کرتا ہوں

ی کسم رنج و ی روم از غولیش  
ی دژم داد و ی کسم فریاد

ترجمہ: دکھ برداشت کرتا ہوں اور اپنے ہوش گنوا بیٹھتا ہوں  
چٹھیں مارتا ہوں اور فریاد کرتا ہوں

کس چہاں جاں بوجھ ازیں ہر دو  
وہر سلاک و آساں ہے داد

ترجمہ: کوئی کس طرح ان دو سے اپنی جان بچائے  
زمانہ ظالم ہے اور آساں ہے انصاف

چوں بخود جور آساں لایم  
یادم آمد از و چہ لطف و داد

ترجمہ: اپنے اوپر جب آساں کے ان مظالم پر نظر ڈالتا ہوں  
تو مجھے اس کی دوستی کے کیسے کیسے مزے یاد آ جاتے ہیں

کاش من ہم پہ او شتاب رسم  
نیمت نہ فہم، غیر ازیں اور داد

ترجمہ: میں بھی کاش! اس سے جلدی ہی جا ملوں  
ان وظائف سے زیادہ عقل کی اور کوئی بات نہیں

بچی انجام آں، ہر آں چہ خود  
آہ من صرصر است و جسم رنواد

ترجمہ: جو کچھ بھی ہو ، الہام ضرور ظاہر ہو گا  
میری آہ آئندگی ہے اور جسم خاکستر

آں سے چاروہ چو گشت تمام  
سے عدد بود زانکہ از ہفتاد

ترجمہ: وہ چودھویں کا چاند جب تمام ہوا  
تو تہتر سال کا تھا

من پہ سے خانہ با بجا آدم  
رشدم کردہ بود ہر چہ رشاد

ترجمہ: اب میں سے خانوں میں وہ احکام بجا لاتا ہوں  
اس نے مجھے جس راہ راست کی ہدایت کی تھی

یعنی آں ساتگیں بکف حافظ  
منصب غوثیگیں بہ غالب داد

ترجمہ: یعنی اس جام شراب بکف حافظ شیرازی نے  
اپنا منصب غالب کو تحويل کر دیا

ی رسد گرچہس دعا کہتم  
اسد اللہ خاں پہ جلد رسد

ترجمہ: یہ دعا اُمید ہے، قبول ہو گی  
کہ خدا اسد اللہ خاں غائب کو جلد نصیب فرمائے

نو عروپ خن جواست بنور  
پہ سفر زود ی رود داماد

ترجمہ: عروپ خن ابھی جوان ہے  
اور کولھا جلد ہی سفر پر جا رہا ہے

فخر عرقی و رجب غائب نرد  
اسد اللہ خاں غائب نرد

ترجمہ: (ک) فخر عرقی و رجب غائب  
اسد اللہ خاں غائب کا انتقال ہو گیا

۱۰

چیز دیگر دون دل پہ بود  
درد دل ام شمار بیرون است

ترجمہ: دل میں دوسری کیا چیز ہو گی  
میرا درد دل اٹھانے سے زائد ہے

سکھت مگر یہ را سکھت چہ ہاں  
خود توان دید دیدہ جیون است

ترجمہ: سکھت زاری کا کیا بیان ہو  
نظر آ رہا ہے کہ آنکھیں دریائے آمو کی طرح بہہ رہی ہیں

دیدہ باشید پیش ازیں کے بود  
عالم اتر چنان کہ اکنون است

ترجمہ: اس سے پہلے تم نے کیا دیکھا ہو گا  
اب جو اتھری دنیا میں ہے

عصم آسا شیم چہ بود ہاں  
ایں ہمہ لحد عصم مردوں است

ترجمہ: میرے آرام ہی کا تو وہ دشمن تھا  
ہر لحد آسمان میرا دشمن ہے



ایں کہ ہندو زیست را برمن  
طرفہ مضمون کذب مضمون ست

ترجمہ: وہ مجھے زندوں میں شامل کرتے ہیں  
یہ ایک عجیب جہنی بر دروغ مضمون ہے

آں حزنیم کہ تا ابد گویم  
روزیم حادزا مع القون ست

ترجمہ: متن واضح نہیں

چوں نہ میرند مردم دانا  
لطف گروں ہ مردم دون ست

ترجمہ: عقل مند کیوں نہ مریں  
کہ آسمان کی مہربانی (صرف) کہنوں پر ہے

ہر گمش دید باچناں حکمت  
گفت ہے شہد ایں فلاطون ست

ترجمہ: جو کوئی بھی اس کی کثرتِ حکمت کو دیکھتا  
تو یہی کہتا کہ (یہ) یقیناً افلاطون ہے

توہاں خود گواہ ایں سخنِ اند  
شہرتِ او ز ہند تا تون<sup>۱</sup> ست

ترجمہ: تون کے رہنے والے خود اس بات کے گواہ ہیں  
کہ اس کی شہرت ہند سے تون تک پہنچ گئی

چرخِ آں کہ داشت از اکسوں<sup>۲</sup>  
کشفِ ہم کنوں ز اکسون ست

ترجمہ: وہ جو کیڑے کے پھول کا چرخن پہنتا تھا  
آج اس کا دھند بھی اتنا ہی ناپائیدار ہو گیا

بود غالبِ ہاں محیطِ کمال  
کشِ یکے نقطہ درِ کمون ست

ترجمہ: غالب یقیناً وہی دائرۂ کمال تھا  
کہ جس کا ایک ایک نقطہ بھی چمکا ہوا موتی تھا

۱۔ تون۔ خراساں کے جنوب میں ایک شہر کا نام جس کو آج کل فردوس کہتے ہیں۔ (فرنگِ سنی جلد ۱۱ ص ۵۰۲)

ذیت است آں کہ بعد مُردن اُو  
چہ قدر با ز خویش مطعون ست

ترجمہ: اب یہی زندگی اس کی موت کے بعد  
اپنے پر کیسی ملامت بھیج رہی ہے۔

با چہ گویم کہ چوں وہ اُو را  
چہ چنان قادرے کہ بے چوں ست

ترجمہ: میں کیا کہوں کہ اس قدرت والے کا کون  
جانشین ہو گا کہ جس کا کوئی مثل ہی نہیں

لفظ و معنی نہ چوں یہ پوشند  
در غم غائب ایں چہ مضمون ست

ترجمہ: شعر کا کیا مضمون ذہن میں آیا غائب  
کے غم میں لفظ و معنی سیاہ پوش کیوں نہ ہوں

ہر خط ی ستودش زیں پیش  
نقد ا بر لب ہمیں اکنون ست

ترجمہ: اس سے پیش تر بھی ہر طرح میں اس ہی کی توصیف کرتا تھا  
اور فقہ! اس وقت بھی میرے لب پر لپکی ہے

فخر مرقی و رشک طالب فرد  
اسد اللہ خاں غالب فرد

ترجمہ: (کہ) فخر مرقی و رشک طالب  
اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہو گیا

۱۱

معم و از اجل شکایت با  
وگر از زیستن عداوت با

ترجمہ: میں ہوں اور موت سے گلے شکوے  
دوسرے: زندگی سے شرمندہ گیاں

آہ زیں رنج با و محنت با  
واو ازیں فتنہ با و آفت با

ترجمہ: فریاد ان غموں اور دکھوں سے  
دہائی ان شرور و مصائب سے

گشتِ مشکوںِ عالمِ ناگاہ  
عافیتِ ہائے منِ مصیبتِ ہا

ترجمہ: ایک دم میری قسمت ہی پلٹ گئی  
اور میرا سکھ بھن مصلاب میں بدل گیا

میرزا غالب آں کہ از وہلی  
نامِ او رفتہ در ولایتِ ہا

ترجمہ: وہ میرزا غالب کہ جن کا نام وہلی سے  
ملکوں ملکوں پہنچ گیا ہے

ق

خود پہ جنتِ رسید و کرو عطا  
بوضع و شریفِ گفتِ ہا

ق

ترجمہ: خود تو جنت پہنچ گئے لیکن  
وضع دار و اشراف کو مصائب عطا کر گئے

وہ چہ غالبِ بہ ہر یکے غالب  
روزی او ز غیبِ نصرتِ ہا

ترجمہ: واہ غالب اور کیا غالب کہ ہر ایک پر چھا جاتا تھا  
اور غیب سے اس کے نصیب میں تسخیرات تھیں

اسد اللہ خاں کہ نام دے است  
تا چھا شیر کوہ سلطنت ہا

ترجمہ: اسد اللہ خاں اس کا نام ہے  
اے شیر کوہ! تجھے کیسے رعب داب نصیب ہیں

چھ قصائد، چھ مثنوی، چھ غزل  
مرتی از دے کھد خیالت ہا

ترجمہ: کیا قصیدہ، کیا مثنوی اور کیا غزل  
ہر شعبے میں مرتی کو بھی اس سے خیالت ہی ہوتی تھی

لطف طبعش بہ میں کہ در ہر شعر  
نہ لطافت کے لطافت ہا

ترجمہ: اس کے لطف طبع پر نظر ڈالو تو ہر شعر میں  
ایک نہیں سکڑوں خوبیاں نظر آئیں گی

چوں نہ دانندش افصح انفسی  
بندگانِ درش فصاحت با

ترجمہ: لوگ اس کو فصیحوں کا فصیح کیوں نہ جانیں  
جب اس کے دروازے کے غلام بھی مجسم فصاحت ہیں

چوں نہ خوانندش ابلغ اہلغا  
کم نہ سہان در بلاغت با

ترجمہ: لوگ اس کو بلیغوں کا بلیغ کیوں نہ کہیں  
کہ وہ بلاغت میں (مشہور عرب خلیفہ) سہان سے کم نہیں تھا

لفظ و در لفظ آں معانی پاک  
شعر و در شعر آں نزاکت با

ترجمہ: اس کا لفظ (کا انتخاب) اور پھر لفظ میں معانی کی خوبی  
اس کا (سانچے میں ڈھلا ہوا) شعر اور پھر شعر میں نزاکتیں

غزلن او ز عالم دیگر  
پہ مجاز اندرش حقیقت با

ترجمہ: اس کا شعر عالم بالا کی چیز ہے  
کہ مجاز کے اندر بھی حقیقت کی جلوہ گری ہوتی ہے

شور ہر نو، ز لذت شعروش  
نکب عنوان او ملاحات ہا

ترجمہ: اس کے شعروں کی لذت کا دنیا میں چرچا ہے  
اور اس دسترخوان کے نکب میں کیسے کیسے مڑے ہیں

از عرافت چہ گویت چہ نہاد  
چہ ظریفان دہر مشق ہا

ترجمہ: اور اس کی عرافت کے بارے میں کیا کہوں کہ اس نے  
ظریفان زمانہ پر کیسے کیسے احسانات کیے ہیں

حسن مخلص چٹان کزو می دید  
کینہ در مرد ہم محبت ہا

ترجمہ: اس کی خوش اخلاقی ایسی تھی کہ  
کینہ پرور انسان بھی (امول) محبت کا قائل ہو جاتا تھا



آں قدر ہا کہ واقف از ہر فن  
آن قدر آ کہ از طریقت ہا

ترجمہ: اس کی قدرت علم اتنی تھی کہ وہ ہر فن سے واقف تھا  
اور اسی قدر آگاہی اس کی مختلف مسابک طریقت میں تھی

ایں کہ گوید کہ رب مشرب بود  
می تراوید از د کرامت ہا

ترجمہ: لوگ (اس کی تحقیق کے طور پر) کہتے ہیں کہ وہ رب مشرب تھا  
کرامات (تو) اس سے نیکی پڑتی تھیں

از مروت نشاں نہ ماند اکنوں  
یارب او مرد یا مروت ہا

ترجمہ: اب مروت کا نشان دنیا سے مٹ گیا  
اے خدا وہ مرا یا مروت و محبت فنا ہو گئے

صحت او کسے کہ یک دم یافت  
دامش دل چہ یافت دولت ہا

ترجمہ: ایک لمحے کو جس شخص کو اس کی صحبت ملتی  
اس کا دل جانتا تھا کہ اس کو کیسے خزانے مل گئے

اُو خداوندِ من ز چندیں سال  
من ثنا خوانِ اُو ز مدت با

ترجمہ: کتنے عرصے سے وہ میرا آقا تھا  
اور میں مدتوں سے اس کا مدح سرا (ہوں)

درمن و اُو ہ یاںکی عشقم  
تا چاہل سال ماند صحبت با

ترجمہ: کہ میرے اور اس کے درمیان  
کہ چالیس سال صحبت رہی

دگر ایں را ہیاں چہ سود کہ باز  
ماند باہم دگر چہ الفت با

ترجمہ: اور اس عرصے میں یہ بیان کرتا  
کہ ہمارے درمیان کیسی محبتیں تھیں، بے فائدہ ہے

چہ بگویم چہ یاقتم از دے  
ہ دل صاف و صدق نیت ہا

ترجمہ: اب کیا بتاؤں کہ مجھے اس سے صدق دلی اور نیک نیتی  
کی کیسی دولت نصیب ہوئی

کردے قصدِ نازد گر گاہے  
چہ نمودے ہ من نصیحت ہا

ترجمہ: اگر بھی میں تاب (شراب) ہونے کا قصد کرتا  
تو وہ مجھے کیسی کیسی نصیحتیں فرماتے

چوں نہ خواند خلقِ مخدوم  
کرومش چند سال خدمت ہا

ترجمہ: لوگ اس کو میرا مخدوم کیوں نہ کہیں  
میں نے کتنے سال اس کی خدمت کی ہے

جود ہا یتم ایں زماں ز پہر  
یادم آں سر ہا و شفقت ہا

ترجمہ: آج جو آسمان کے یہ ستم مجھ پر ہو رہے ہیں  
تو مجھے اس کی محبتیں اور شفقتیں یاد آتی ہیں

اے کہ پی گزشت پر تو چہا  
نہ ای آ کہ ازیں حقیقت ہا

ترجمہ: اے طالب! تو جو مجھ سے میرا احوال پوچھتا ہے  
تو کیا تجھے ان حقائق سے آگاہی نہیں

فخر مرئی و رشک طالبِ مُرد  
اسد اللہ خاں غالبِ مُرد

ترجمہ: (کہ) فخر مرئی و رشک طالبِ مُرد  
اسد اللہ خاں غالبِ مُرد کا انتقال ہو گیا

۱۲

ہائے! آں مرد نامدار چہ شد  
ہائے! آں فکرِ روزگار چہ شد

ترجمہ: ہائے! وہ نامور کہاں چلا گیا  
ہائے! وہ کہ باعثِ فخرِ زمانہ تھا، کہاں چلا گیا

تاچہ سرسبز باغ و رنگیں گل  
ہائے! آں خوش نوا ہزار چہ شد

ترجمہ: باغ کی طراوت و پھولوں کی رنگینی کس واسطے ہے  
ہائے! وہ خوش الحان لیل کہاں چلا گیا

اعتبار است این زماں ہمہ خوار  
ہائے! آں صاحبِ اعتبار چہ شد

ترجمہ: لفظِ اعتبار کی عزت اتنے مہنی  
ہائے! وہ صاحبِ اعتبار کہاں چلا گیا

گریم و پرسم از کنارہ کشاں  
ہائے! آں بحرِ بے کنار چہ شد

ترجمہ: میں روتا ہوں اور کنارہ کشوں سے پوچھتا ہوں  
کہ وہ بحر ہے کنار کہاں گیا

کام گارے بہر درست گدا  
ہے! آں شاہ کامگار چہ شد

ترجمہ: ہر کامیاب شخص اب گدا نظر آتا ہے  
ہے! وہ شاہ کامیاب کہاں چلا گیا

گشت خود سانحہ دریی ایام  
ہے! آں سانحہ نگار چہ شد

ترجمہ: وہ بذات خود ان دنوں سانحہ بن گیا  
افسوس! وہ سانحہ نگار کہاں چلا گیا

جا بہ حکم خسرواں می داشت  
ہے! آں درِ شاہوار چہ شد

ترجمہ: وہ جو بادشاہوں کے تاج کے شایان شان تھا  
ہے! وہ درِ شاہوار کہاں چلا گیا

یکہ اکنوں پناہ خواہم جست  
ہائے! آں آئیں حصار چہ شد

ترجمہ: میں تجھ اب (اپنے لیے) پناہ ڈھونڈوں گا  
ہائے! وہ جو (میرے لیے) فولاد کا قلعہ تھا، کہاں چلا گیا

دیدن خاک ریش ستم ست  
ہائے! آں قصر زرنگار چہ شد

ترجمہ: اس کی قبر کی مٹی دیکھنی ستم ہے  
ہائے! وہ جو زرنگار قلعہ تھا، کہاں چلا گیا

گفتہ بود ایں، خودم زیم صد سال  
ہائے! آں عہد استوار چہ شد

ترجمہ: خود ہی تو اس نے کہا تھا میں سو سال زندہ رہوں گا  
ہائے! وہ بکا وعدہ کہاں چلا گیا

میرزا غالب آں کہ ہے کم و کیف  
ہند را بود الخار چہ شد

ترجمہ: وہ میرزا جو ہے کم و کاست  
فخر ہندوستان تھا، کہاں چلا گیا

شدن او نہ دہر زارم ساخت  
ویں نہ دامن دل خزار چہ شد

ترجمہ: اس کی موت نے مجھے خوار کر دیا  
اور اب مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ دل ناتواں کا کیا ہوا

بود معمور ازیں دیار سخن  
نیں کہ ہے او دریں دیار چہ شد

ترجمہ: اُس سے دیار سخن آباد تھا  
اس کے بغیر، دیکھو اس شہر کا کیا حال ہو گیا

آں کہ بود از چشم نفور چہ شد  
واں کہ از فخر داشت عار چہ شد

ترجمہ: وہ شخص جسے نمودِ شان و شوکت سے نفرت تھی، کہاں چلا گیا  
وہ شخص کہ جس کو تکبر نے عار آتی تھی، کہاں چلا گیا



نالہ زیں پس کشیدم عبث است  
گر کشیدم ہزار بار چہ شد

ترجمہ: اس کے بعد آہ و زاری کرتا ہے سو ہے  
اور اگر ہزار بار کی بھی تو کیا حاصل ہوا

دل و چہرے الم چہ واقع گفت  
من و اندوہ بے شمار چہ شد

ترجمہ: ایک دل اور اسنے (بہت سے) غم تو آخر کیا حال ہوا  
ایک میں اور اسنے سارے دکھ، کیا حال ہوا

گر اجل گفت زود ی ایم  
حاصلم غیر از انتظار چہ شد

ترجمہ: اگرچہ موت نے کہا تھا کہ جلد ہی آؤں گی  
لیکن مجھے تو سوائے انتظار کے اور کچھ حاصل نہ ہوا

انچہ اسال ی شود پیدا  
چہ دہم شرح آنکہ پار چہ شد

ترجمہ: اس سال جو ہو رہا ہے وہ ظاہر ہے  
پار سال کیا ہوا اس کا کیا بیان کروں

دائے کو کہ گیرش یک بار  
در غمش گر شدم غبار چہ شد

ترجمہ: وہ دامن کہاں ہے کہ اس کو کوئی ایک بار پکڑ لے  
اگر میں اس کے غم میں غبار ہوا بھی تو کیا فائدہ

وہ ہلاک خودم کنوں مجبور  
داشتم ہرچہ اختیار چہ شد

ترجمہ: آج میں اپنی جان لینے پر مجبور ہوں  
کبھی جو ہر چیز پر مجھے اختیار تھا کہاں چلا گیا

آں گریباں کہ داشتم سالم  
چہ شد آہ تار تار چہ شد

ترجمہ: میرا گریباں تو صحیح سالم تھا  
ایسا کیا واقعہ ہوا کہ تار تار ہو گیا

ایں میری اسے نکلاں کہ در غم او  
چہ اہل چوں شدم دوچار چہ شد

ترجمہ: اے مخاطب! نہ پوچھ کہ اس کے غم میں  
جب میں اہل سے دوچار ہوا تو کیا غش آیا

شد ہر جملہ در غم کہ میری  
حاصل از عمر مستعار چہ شد

ترجمہ: ایک ناقابل بیان غم میں ساری زندگی بسر ہو گئی  
اور اس عمر مستعار سے حاصل کچھ بھی نہ ہوا

بود صبر و قرار مونس من  
صبر آوارہ شد، قرار چہ شد

ترجمہ: صبر و کلیب ہی میرے رفیق تھے  
صبر آوارہ ہو گیا اور قرار کہیں کھو گیا

آں کہ ہر دم چہ مستی بے سرشار  
بود آں کو نہ ہوشیار چہ شد

ترجمہ: وہ کہ ہر لمحے ایک گونہ مستی میں سرشار ہونے کے باوجود  
اس قدم بیدار رہتا تھا، کہاں چلا گیا

آں کہ از فرط سینہ صافی ہا  
ہم باغیار بود یار چہ شد

ترجمہ: وہ شخص کہ اپنے صفائے قلب کی کثرت سے  
باغیار کا بھی دوست تھا، کہاں چلا گیا

آں کہ را صور حشر بود قلم  
حشر برپا بر مزار چہ شد

ترجمہ: جس کے لیے صور حشر اس کا قلم تھا  
اس کے سر مزار حشر کا برپا ہوتا فصول ہے

مرگ چوں شد دوچار او دیدی  
وہ من و زلیست کارزار چہ شد

ترجمہ: جب موت اس سے دوچار ہوئی تو تو نے دیکھا  
کہ میری اور زندگی کی کیسی جنگ ہوئی

اے کہ پری چہ شدہ نمی بجی  
برہم ایں لکھ جملہ کار چہ شدہ

ترجمہ: تو جو پوچھتا ہے تو کیا تجھے نظر نہیں آتا  
کہ اس وقت یہ سارا کاروبار حیات کس طرح چاہو گیا

فخرِ مرّی و رُھبِ طابِ نرد  
اسد اللہ خاں غالبِ نرد

ترجمہ: (کہ) فخرِ مرّی و رُھبِ طابِ نرد  
اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہو گیا

۱۳

چرخِ بیداد گر چہ باہ کرد  
دہرِ نڈھور و شر چہ باہ کرد

ترجمہ: (اگر) فلک نا انصاف ہے کیا کیا جائے  
(اگر) زمانہ شور و فساد سے بڑے ہے تو کیا کیا جائے

حالا من شد ہتر چہ باہ کرد  
حالا دل ہم دگر چہ باہ کرد

ترجمہ: میرا حال بدتر ہو گیا تو کیا کیا جائے  
اور دل کا حال براہم ہے تو کیا کیا جائے

قصہ درد من دراز بے ست  
دوستاں مختصر چہ باجہ کرد

ترجمہ: میری داستان غم بہت طویل ہے  
اے دوستو! اس کو مختصر کیا کیا جائے

ایں صدا خیزد از دلم کہ نکست  
کہہ اندوہ کمر چہ باجہ کرد

ترجمہ: میرے دل سے آواز آ رہی ہے  
کہ غم کے پہاڑ نے میری کمر توڑ دی، کیا کیا جائے

در تلاش دوا چہ باجہ نمود  
چارہ درد سر چہ باجہ کرد

دوا کی تلاش میں مر جانے سے کیا حاصل  
درد سر کا علاج کیا کیا جائے

ہم چاک ست دل چہ باہ گشت  
ہم خون شد جگر چہ باہ کرد

ترجمہ: سارا دل چاک چاک ہے، کیا کیا جائے  
سارا جگر خونم خون ہو گیا، کیا کیا جائے

نرد شعر و سخن چہ باہ خواند  
دقت علم و سخن چہ باہ کرد

ترجمہ: شعر و سخن کو موت آگئی، (اب) پڑھنے کو کچھ نہ رہا  
علم و سخن دنیا سے اٹھ گئے، کیا کیا جائے

نام نام آوری چہ باہ نرد  
نرد آں نامور چہ باہ کرد

ترجمہ: اب نام نام وری کیا لیا جائے  
کہ جب وہ نام وری مر گیا، کیا کیا جائے

روے امن و اماں چہ باہ دید  
من و ضعیف ہمار، چہ باہ کرد

ترجمہ: اب امن و امان کی صورت کیا دیکھنی  
(ہائے!) اس اور میری بصلت کی یہ کم زوری، کیا کیا جائے

دام از حد فزوں چه باید زیست  
عمر آمد بسر چه باید کرد

ترجمہ: دام (آزد) حد سے زائد ہے، (اب) ازمدہ رہنا فضول ہے  
میری عمر بھی اب اسجا کو پہنچ گئی، کیا کیا جائے

منم از گریہ آب ست  
دیدہ ہر لعل تر چه باید کرد

ترجمہ: متن واضح نہیں  
ہر لعل آنکھیں کیوں تر دکھی جائیں

چہ زار مرا رسید از غیب  
مژدہ ہائے شرر، چه باید کرد

ترجمہ: میرے چہ زار کو غیب سے  
چنگاریوں کی خوش خبریاں پہنچ چکی ہیں، کیا کیا جائے



میں دکان چیدہ بوم از ہے نفع  
نفع میں شد ضرر چہ ہایہ کرد

ترجمہ: میں نے تو نفع کے لیے دکان کھولی تھی  
میرا نفع نقصان بن گیا، کیا کیا جائے

میں بے گشتہ بوم از ہے امن  
امن میں شد خطر چہ ہایہ کرد

ترجمہ: میں تو سکون کی تلاش میں بہت سرگرداں رہا تھا  
میری (تلاش) سکون ہی خطرہ بن گئی، کیا کیا جائے

گر یہ ام کرد انچہ کرد در  
دو سوے بام و در چہ ہایہ کرد

ترجمہ: میری آہ و زاری نے جو کرنا تھا کر دیا  
اب بام و در کی طرف رخ کرنا بے معنی ہے

مردنش حیر دو بہ دل کوئی  
دلم دل کاوگر چہ ہایہ کرد

ترجمہ: اس کی موت نے گویا دل پر تیر مار دیا  
اب بھلا دھم دل کو ہا اثر کیا کیا جائے

در چنین حال مگر بلا آید  
بخشم از دے حذر چه باید کرد

ترجمہ: ان حالات میں اگر کوئی آفت  
مجھے پیش ہو تو اس سے بچتا فضول ہے

گر کیے رفت و دگرے آمد  
درد از دل بدر چه باید کرد

ترجمہ: اگر ایک گیا اور دوسرا آ گیا  
تو اخراج درد دل فضول ہے

چرخ و ایں مایہ جور ناچارم  
نالہ شد ہے اثر چه باید کرد

ترجمہ: مجھ بے بس پر آسمان کے اس کڑت سے ستم (ہیں)  
میرا رونا چھٹتا ہے اثر ہو چکا ہے، کیا کروں

اے کہ گوئی دےے مرد از خویش  
نہست صبر ایں قدر چہ باید کرد

ترجمہ: ٹم جو کہتا ہے کہ ذرا ہوش سنبھالو  
(تو بچی بات یہ ہے کہ کلمھ میں اب صبر باقی نہیں کیا کیا جائے

مرغ دل را فلک چہ دور اما  
ریخت وقتے اگر چہ باید کرد

ترجمہ: یوں تو مرغ دل کے لیے آسمان بہت دور نہیں  
لیکن اگر آسمان ہی گر جائے تو کیا کیا جائے

خاک شد خاک میرزا غالب  
غیر خاشک بہ سر چہ باید کرد

ترجمہ: میرزا غالب تو مر کے مٹی ہو گئے  
اب ان کی خاک کے سوا اور سر پہ کیا ڈالا جائے

ہر کہ رقص باز کے آید  
صبر ہم کونہ مگر چہ باید کرد

ترجمہ: ہر وہ شخص جو گیا تو واپس کب آتا ہے  
یک کونہ مہر سے (بھی) کیا ٹامدہ

آں کہ جز در حشر نہاد گئے  
کرد ازیں جا سفر چہ باید کرد

ترجمہ: وہ کہ ہمیشہ موجود رہتا تھا، اب جو  
وہ سفر پر روانہ ہو گیا تو کیا کیا جائے

آں کہ سن داشتیم از و چشمے  
چوں گلند از نظر، چہ باید کرد

ترجمہ: اس شخص ہی نے، جس سے امیدیں تھیں  
مجھے اپنی نظر سے گرا دیا تو اس کا کیا علاج

عالم این او بخواب خوش در گور  
بے خبر را خبر چہ باید کرد

ترجمہ: (ہمارا) یہ حال ہے اور وہ میٹھی نیند سو رہا ہے  
اب بے خبر کو باخبر کیا کرنا

دیم آخر ہر آن چہ بخش آمد  
چہ قضا و قدر چہ باید کرد

ترجمہ: جو کچھ بھی مجھ پر پڑی، میں نے برداشت کی  
مشیت الہی کا کیا علاج ہے

حیرہ دہلی چراغ دہلی کو  
سوے دہلی گزر چہ باید کرد

ترجمہ: چراغ دہلی بجھ گیا اور دہلی تاریک ہو گئی  
اب دہلی کی طرف جانا ہی بے معنی ہے

چند کوئی تو و فغاں تا چند  
نقد! خاموش! دگر چہ باید کرد

ترجمہ: تو کب تک اپنی داستانِ غم سنائے گا اور آہ و فغاں کرے گا  
نقد! خاموش ہو جا! اب اس کے علاوہ اور کیا کیا جاسکتا ہے

غیر مرقی و رشکِ طالبِ مُرد  
اسد اللہ خاں غالبِ مُرد

ترجمہ: (کہ) فقرِ عرقی و رطبِ طالب  
اسد اللہ خاں غالب کا اقبال ہو گیا

۱۳

اے خوشا اُدو خوشا فضیلتِ اُدو  
مُرد اما نہ مُرد شہرتِ اُدو

ترجمہ: کیا کہنے اس کے اور اس کی فضیلت کے  
کہ خود مر گیا لیکن اس کی شہرت نہ مٹی

خواجہ خود را مصاحبِ جبریل  
ہر کرا شد نصیبِ صحبتِ اُدو

ترجمہ: جس کسی کو اس کی صحبت نصیب ہوئی  
وہ اپنے آپ کو جبریل کا مصاحب کہنے لگا

آں نکلائی کہ بود از سمجہ  
سجّ اندوخت از فراستِ اُدو

ترجمہ: سمجہ کا رہنے والا جو نکلائی تھا  
اس کا اندوختہ بھی اسی کی دانیش سے کیا ہوا تھا

یہاں آ کہ است ازیں کہ چہ کرد  
چہ نصیرا کوائے نصرت او

ترجمہ: متقن واضح نہیں

شد ولی ہر کہ دیدہ دیوانش  
از کلامش عیاں کرامت او

ترجمہ: جس نے اس کا دیوان پڑھا، خود ولی ہو گیا  
اس کے کلام سے اس کی کرامت ظاہر ہوتی تھی

ہاں نہیں کلیات او کہ در آں  
قدرت او عیاں ز قدرت او

ترجمہ: اس کے کلیات کو دیکھو تو  
اس کی قدرت (کلام) اس کی قدرت سے ظاہر ہوتی ہے

رفعت او ز آہاں برتر  
آہاں را حسد ز رفعت او

ترجمہ: اس کی بلندی آسمان سے بھی زیادہ تھی  
اسی لیے آسمان اس سے اس کی بلندی پر حسد کرتا تھا

پارسا بود خواہ . خواہی رند  
من یہاں ہجو طریقت او

ترجمہ: چاہے وہ پارسا تھا، چاہے رند  
میں بہر حال جان و دل سے اس کا ہجو طریقت تھا

کو نورسد بے کم ست ہنوز  
کو دیر دیر و مدحت او

ترجمہ: مشکل ہی سے کوئی طے گا کر کہ سکے  
کہاں مستحقِ فک اور کہاں اس کی مدح

کو نکلائی ست پہلوانِ سخن  
دیدہ پایہ ہ نظم طاقت او

ترجمہ: اگرچہ نکلائی پہلوانِ سخن ہے  
لیکن اس کی طاقتِ سخن وری بھی عملِ نظر ہے



عامیوں کو زیادہ تر مصنون  
نہ ہے خاصا ہمیں مروتِ اُد

ترجمہ: عوام اس کے زیادہ احسان مند تھے  
اس کا تعلق خاطر صرف خواص سے نہیں تھا۔

اسد اللہ خود ولی از دل  
ہے علی پیشتر محبتِ اُد

ترجمہ: اسد اللہ (خاں) خود ولی تھے  
(اور) حضرت علیؑ سے انہیں زیادہ محبت تھی

شکر نشیدش چہاں نہ سہم  
نہ شنیدم ز کس شکایتِ اُد

ترجمہ: اس کی شہر خوانی کا شکر کیوں نہ کروں  
کہ میں نے کسی شخص سے اس کی شکایت نہیں سنی

چٹھی من اعتقاد من راج  
طاقتِ حق بود اطاعتِ اُد

ترجمہ: میرا اعتقاد اپنی جگہ پختہ ہے  
میں اس کی اطاعت کو اطاعتِ حق سمجھتا ہوں

مکمل ہو طاعتِ حق ماع  
ہر کہ در سایہِ عنایتِ او

ترجمہ: متن واضح نہیں

وگر اندر بہشت جاے یافت  
روزِ محشر ہم از شفاعتِ او

ترجمہ: بہشت میں دوسروں کو بھی  
اس ہی کی سفارش پر جام (شرابِ طہور) ملا

ہم خدا، ہم رسولِ ازو راضی  
تاکہ خوش دینِ او و ملتِ او

ترجمہ: خدا اور رسولِ دونوں اس سے راضی ہیں  
چوں کہ دین و ملت بھی اس سے خوش ہیں

کہینہ توڑی ہے دشمن ارزانی  
مہرورزی خلق عادت او

ترجمہ: کہینہ پروری دشمن ہی کو نصیب ہو  
کہ خلق خدا سے محبت اس کی عادت تھی

یا دگر کس کجا معاذ اللہ!  
یود از نفس خود عداوت او

ترجمہ: نعوذ باللہ! کسی دوسرے سے کہاں  
اس کی دشمنی تو اپنے نفس ہی سے تھی

آسمان پر زمیں چھا نہ تھا  
چہ بلا یود وقت رحلت او

ترجمہ: بھلا آسمان زمین پر کیوں نہ گر پڑا  
کیا بلا تھی جو اس کی وفات پر نازل ہو گئی تھی

بسلامت سلام من کاں خود  
یود ولایت سلامت او

ترجمہ: یہ ہمہ فخریت میرا سلام (پہلے) کہ وہ خود  
اپنی سلامتی سے وابستہ تھا

چشم ازیں ہم رواست گر گویم  
کم نہ از وصل مرگ فرقت او

ترجمہ: اس سے پہلے بھی یہ کہتا جائز ہے  
کہ اس کی فرقت موت کے برابر ہے

ہاویم بود در بلاغت و شعر  
یادم آید چہا ہدایت او

ترجمہ: فنِ بلاغت و شعر میں وہ میرا رہ نما تھا  
مجھے اس کی کیا کیا ہدایات یاد آتی ہیں

ہمن کم سواد و کم مایہ  
بود از حد زیاد شفقت او

ترجمہ: مجھ کم علم و کم حیثیت شخص پر  
وہ اعجاب کی شفقت کرتا تھا

داشته از دُورِ مہرِ یاد  
انجمنِ ہودہ یا کہ غلوتِ آو

ترجمہ: وہ مجھے امتحانے محبت سے یاد رکھتا  
انجمنِ ہوتی یا غلوت

از من اکوں قلمِ ملکِ خن  
خسروی یا تم بدولتِ آو

ترجمہ: آج قلمِ ملکِ خن میرے زیرِ نگین ہے  
لیکن یہ بادشاہت مجھے اس کی بدولت ملی ہے

نہ ز سائلِ دروغ تا جانِ  
جانِ حاتمِ فدائے ہمتِ آو

ترجمہ: سائل سے کبھی اپنی جان بھی نہ بچا کر رکھتا  
اس کی ہمت پر جانِ حاتم بھی قربان کی جائے تو درست ہے

ایں گویا کلابِ شد طالع لے  
سوزِ دمِ تفتہ یاو طلعتِ آو

ترجمہ: یہ نہ کہہ کہ روشن آفتاب بدکردار ہو گیا  
اے وقت! مجھے اس کی روشنی کی یاد دلگا رہی ہے

فرض اکوں جز ایں چہ حرف کہ خود  
چوں نہ میرم ز درد فرقتِ او

ترجمہ: الفرض فی الوقت سوائے اس کے کہ میں اس کی  
جدائی میں کیوں نہ مر جاؤں، کیا کہوں

فخرِ مرقی و رقبِ طالبِ مُرد  
اسد اللہ خاں غالبِ مُرد

ترجمہ: (ک) فخرِ مرقی و رقبِ طالبِ مُرد  
اسد اللہ خاں غالب کا انتقال ہو گیا

۱۵

غیر ازیں تاچہ چیزِ او را باد  
جملہ اشیا و جملہ اسما باد

ترجمہ: اب اس کے علاوہ اس کو کیا دعا دی جائے  
کہ دنیا کے سلسلے (اشیاء و اسماء) میں اس کے ہم ہو جائیں

خونِ اُردو چہ عرشِ اعلا باد  
از لبِ اُردو خیلِ مسیحا باد

ترجمہ: اس کی شاعری کا چہ چا عرشِ معنی ہے ہو  
اور مسیحا بھی اس کے انگاس سے شرمندہ ہو جائے

رفتِ غالبِ مگر از جہاں، من ہم  
روم از خویشتِ ہر چہ بادا باد

ترجمہ: غالبِ دنیا سے چلا گیا تو میں بھی  
ہر چہ بادا باد از خود رفتہ کیوں نہ ہو جاؤں

صحتِ اُردو نصیبِ رضواں را  
پیشِ ازیں مگر نہ گشتِ حالا باد

ترجمہ: داروئے بہشت کو اس کی صحت  
پہلے نہ ملی تو اب نصیب ہو

جا لطفِ آں کہ داشتِ ایں جا نیز  
ور بہشتِ مخلصِ جا باد

ترجمہ: یہاں پر بھی چوں کہ وہ ستری جگہوں پر رہتا تھا وہاں جنت میں بھی اس کو مسکن جاوید ملے

واندر آں جائے دل کش و دل خواہ  
ہرچہ دل خواہش، مہیا باد

ترجمہ: اور اُس دل کش اور پسندیدہ جگہ پر جو چیز وہ چاہے اس کو مل جائے

عشوۂ دل براں پسندش بود  
جلوۂ حور روزی او را باد

ترجمہ: یہاں اس کو محبوبوں کے ناز و عشوے پسند تھے وہاں بھی جلوۂ حور اس کو نصیب ہو

راضی از دے چناں کہ خلقے بود  
ہم چناں شاد حق تعالیٰ باد

ترجمہ: یہاں جس طرح خلق خدا اس سے خوش تھی وہاں خداوند تعالیٰ بھی اس سے اسی طرح خوش ہو



با اثر باد ایں دعا و ذکر  
از منش ہر زماں ۵۳ باد

ترجمہ: اے خدا! اس دعا کو اثر دے! اور  
دوسرے یہ کہ میری طرف سے اس کو ہر لمحے محبت ملے

مکشید بود او سدا تمنا مرا  
دلِ ما نیز بے تمنا باد

ترجمہ: وہ ہمیشہ سرکشید تمنا رہا  
خدا ہمارے دلوں کو بے تمنا کر دے

حور ماند اگر ازو مستور  
باشد ایں ہم دعا کہ رسوا باد

ترجمہ: اگر حور اس سے چھپے  
تو میری یہ دعا ہے کہ وہ حور بھی رسوا ہو

راز ہر یک بر آں کہ روشن بود  
درد ما ہم بود ہو چھا باد

ترجمہ: جس طرح اس پر ہمارے سارے دل کے راز روشن تھے  
ہمارا درد بھی اس پر عیاں ہو

ہست آں جملہ معنی رنگیں  
آں چہ باقی بماند از ما باد

ترجمہ: غالب نے تمام معنی رنگیں (اپنے اشعار میں) باندھ لیے  
جو باقی رہ گئے ہیں، وہ ہماری تا اہلی کے سبب ہیں

تا بہ بینند حسنِ شاعر پیش  
چشمِ اہل زمانہ چٹا باد

ترجمہ: تاکہ اس کی شاعری کا حسنِ نظر آتا رہے  
خدا کرے کہ اہل زمانہ کی بصارت قائم رہے

یا رب! آں دل کہ در غمش گلداخت  
چہ دل مست او ہتر ز خارا باد

ترجمہ: یا خدا وہ دل، جو اس کے غم میں نہیں بکھلا  
پتھر سے بھی بدتر (کوئی چیز) ہو جائے

مگر چہ غم خواریم اجل آید  
نذر او جان ناکھیا باد

ترجمہ: اگر اس کی غم خواری میں مجھے موت آئے  
تو یہ جان ناکھیا اس کی نذر ہو

دور غمش ہر کہ ترک دنیا کرو  
یا رب! او را ثواب عقی باد

ترجمہ: اس کے غم میں جس نے بھی ترک دنیا کیا  
خدا! اس کو ثواب عاقبت ارزانی ہو!

قصہ طوف حزار او چہ کلم  
پا نمود اگر نہ سر پا باد

ترجمہ: اس کے حزار کے طوف کا کیا ارادہ کروں  
اگر میں پاؤں نہ ہو سکوں تو میرا سر پاؤں میں جائے

ہر لب کوثر و لب تنہیم  
سر خوشی ہائے او دو بالا باد

ترجمہ: لب کوثر و تقسیم پہ  
خدا کرے اس کی سرمستیاں بڑھ چڑھ کر ہوں!

جز بہ جزنت نخواستہ او آسود  
خاتہ اعتقاد من آباد

ترجمہ: وہ جزنت کے علاوہ اور کہیں آسودہ نہیں ہو گا  
خدا میری عقیدت کے گھر کو آباد رکھے!

در غمش خاک سہشتم و ہ من  
کس نیادرد رم فا باد

ترجمہ: میں اس کے غم میں خاک ہو گیا لیکن  
سوائے ہوا کے میرے اُد پہ کسی کو رم نہ آیا

انچہ امروز کرد کار نگو  
حاصلش اجر روز فردا باد

ترجمہ: جس نے آج کے دن دنیا میں نیکی کی  
خدا روزِ عاقبت اس کا اجر عطا فرمائے!

میں کہ دو دم ازو مرا یا رہا  
سینہ، صحرا و دیدہ و دیبا باد

ترجمہ: میں کہ جو اس سے چھڑ گیا ہوں  
میرے سینے کو صحرا اور آنکھ کو دیدہ بنا دے

انک تو گر ہمیں زمیں پہ گرفت  
آو من تقدّا عرش بنا باد

ترجمہ: اگر میرے سارے آنسو زمین میں جذب ہو گئے  
تو تقدّا کاش میری آو ہی عرش پر پہنچ جائے

توانم شناخت مرگ از زہمت  
و تن من مباد جاں یا باد

ترجمہ: اب میرے جسم میں جاں رہے نہ رہے  
میرے لیے موت اور زہمت میں کوئی امتیاز نہ رہا

و فراقی ہاں نہا سایہ  
گر بگویم کھلیب، حلقا باد

ترجمہ: اُس بُھا ساجے غالب کی فرقت میں  
اگر میں صبر تلاش کروں تو خدایا! بھی نہ ملے!

ہر چہ کسٹم پہ حقِ اُد آں را  
از ثری ثری شمرہ تا ثریا باد

ترجمہ: میں نے غالب کے بارے میں جو کچھ بھی کہا ہے  
خدایا! اس کا شمرہ زمین کی اچھلی پتھریں سے فلک کی اچھلی  
بلند ہیں تک پہنچا دے!

ہر دیراں، ہر خراب اکوں  
ماہ ملکِ سخن کیا آہ

ترجمہ: اب ملکِ سخن سارا کا سارا  
خراب و دیراں ہے اور آئہ چکا ہے

فخرِ مرتی و رنجِ غالبِ مُرد  
اسد اللہ خاں غالبِ مُرد

ترجمہ: (اس لیے کہ) فخرِ مرتی و رنجِ غالب  
اسد اللہ خاں غالب کا احوال یہ کیا

غالب کا سفرِ کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ

خلیق انجم

غالب کے خطوط (جلد اول)

خلیق انجم

نقش ہائے رنگ رنگ

مترجم: ڈاکٹر صابر آفاقی

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی۔ ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال

کراچی۔ ۷۵۳۰۰

الماس کے ریزے  
مرزا مصباح الدین فیروز

خواتین کے اردو سفرناموں کا تحقیقی مطالعہ  
ڈاکٹر صدف فاطمہ

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری  
حیات اور ادبی کارنامے  
ڈاکٹر محمد زاہد

انجمن ترقی اردو پاکستان  
ڈی۔ ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال  
کراچی۔ ۷۵۳۰۰



# Bar-e-Ghalib ka kuch bayan hojaey

By Partau Roheela

## انجمن کی تازہ مطبوعات

قیمت	مصنف	نام کتاب
70/-	میر انکساعت حسن انکس	دیکھائی دانی انکس
240/-	ظیفی انجم	میر غائب کے خطوط (جلد اول)
250/-	ڈاکٹر علی احمد غامی	۳۔ عبداللطیف شرر بہ طبعیت ہاں ہاں
350/-	ڈاکٹر نسیم آرا	۴۔ بارود و محلات کے ارتقا میں خطرات کا حشر
300/-	ڈاکٹر شازیہ حیرتی	۵۔ بابائے اردو مولوی عبدالغنی انور مرید مدنی
350/-	ڈاکٹر نسیم منی	۶۔ اختر شیرانی اور جدید اردو ادب
250/-	ڈاکٹر مولوی مہدی انجم	۷۔ قہار اہوارو
250/-	مادھی مولوی مہدی انجم	۸۔ سب دلی
400/-	مرتبین حسن نسیم ڈاکٹر ممتاز احمد خان	۹۔ قرآن انجمن حیدر مدنی انکس کے قاری
	شہاب قدوائی	
400/-	ڈاکٹر محمد عطاء اللہ خان	۱۰۔ اردو اور فارسی کے روابط
300/-	سراج جامعہ دہلی	۱۱۔ جدید اردو شاعری (جلد اول)
300/-	ڈاکٹر مولوی مہدی انجم	۱۲۔ چھوٹے صبر
350/-	ڈاکٹر ذوالقرنین احمد (شہاب امراتی)	۱۳۔ کوئی غرا سو بہت دھڑکتا
150/-	پروفیسر سحر علی	۱۴۔ اردو شاعری میں بے سہارہ صاف کی جالی
400/-	مرتبین ڈاکٹر ممتاز احمد خان	۱۵۔ انقلاب سر ہائی "اردو" (۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۷ء)
	شہاب قدوائی	
400/-	ڈاکٹر انور سعید	۱۶۔ اردو ادب کی تحریکیں (۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۷ء)
320/-	ڈاکٹر محمد کمران	۱۷۔ پروفیسر احمد علی حیات اور ادبی حیات
350/-	پروفیسر سحر علی قاسم	۱۸۔ قرآن انجمن حیدر کے انکس (ایک لکھائی دیکھائی دیکھائی)
600/-	مرزا مصباح الدین حیرتی	۱۹۔ انکس کے رچے
400/-	ڈاکٹر صدق قاسم	۲۰۔ لکھائی کے اردو سطرانوں کا تحقیقی مطالعہ
300/-	ڈاکٹر محمد زاہد	۲۱۔ ڈاکٹر محمد انجمی کی زندگی۔ حیات اور ادبی کارنامے